اسلامی اجتماعیت کی ہیئتِ کاملہ

(ریاستی نظام)

حکومتی نظام کی ناگزیر ضرورت

اجتماعیت کا نقطۂ کمال اور اس کی آخری منزل ایک حکومتی نظام کا قیام ہے۔ یہ نظام بجائے خود تو مطلوب نہیں ہوتا، لیکن عملی طور پر انسانی معاشرے کی ایک ناگزیر ضرورت بہرحال ہے۔ کیونکہ جس طرح یہ ایک حقیقت ہے کہ نوعِ انسانی کے افراد اپنی فطری طلب کی بنا پر اور اپنی فطری ضرورت کے تحت ایک ساتھ اکٹھے ہو کر زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوتے ہیں، اسی طرح یہ بھی ایک حقیقت یہ ہے کہ ان کا یہ اجتماعی گزر بسر کچھ ایسے مسائل بھی پیدا کر دیتا ہے جن کا حل ضروری ہوتا ہے، اتنا ہی ضروری جتنا کہ بچے کے لیے ماں کی گود اور باپ کا سایہ ضروری ہوا کرتا ہے۔ کیونکہ یہ مسائل ایک طرف تو مستقلاً موجود رہتے ہیں، دوسری طرف انتہائی اہم بھی ہوتے ہیں۔ مستقلاً موجود اس لیے رہتے ہیں کہ ان کا سرچشمہ کہیں خارج میں نہیں ہوتا کہ وہ کبھی پیدا ہوں تو کبھی پیدا نہ بھی ہوں، بلکہ انسان کے اپنے اندرون ہی میں ہوتا ہے۔ یہ دراصل اس کی اپنی جبلت ہی ہوتی ہے جو انھیں جنم دیتی ہے۔ اس لیے جب تک وہ اپنی جبلت سے بلند اور آزاد نہیں ہو جاتا، جو کم از کم ننانوے فی صد افراد کی حد تک تو قطعاً ناممکن ہے، یہ مسائل لازماً پیدا ہوں گے، اور مستقلاً موجود رہیں گے۔ 'انتہائی اہم' اس لیے ہوتے ہیں کہ ان کی وجہ سے اجتماعیت کی غایت ہی فوت ہو جاتی ہے، بلکہ یوں کہیے کہ اس کے عملی نتائج بالکل الٹے نکلنے لگتے ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ انسان کے اندر جہاں خیر کی قوتیں موجود ہیں، وہیں پہلو بہ پہلو شر کی قوتیں بھی کارفرما ہیں۔ نوعِ انسانی کے کردار کی پوری تاریخ اسی بات کی گواہی دیتی ہے، اور قرآن حکیم کا صاف وصریح اعلان بھی یہی ہے، جس نے فرمایا ہے کہ ''اللہ تعالیٰ نے انسان کے دل میں تقویٰ اور فجور، دونوں کا

الہام کررکھا ہے (فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوٰهَا)۔اس امر واقعی کی موجودگی میں اور اپنی اس جبلت کے ساتھ جب بہت سے انسان اکٹھے ہو کر رہیں گے تو یقیناً وہی کچھ ہوگا جس کا ہم ہر لمحہ مشاہدہ کرتے رہتے ہیں۔ایک طرف اگر دوسروں کے ساتھ انصاف پسندی، خیر خواہی، ہم دردی اور ایثار کے رویے اختیار کیے جا رہے ہوں گے تو دوسری طرف افراد کی خواہشوں میں ٹکراؤ بھی ہوگا، مفادات میں کش مکش بپا ہوگی، خود غرضیوں کا زور ہوگا، اور اس کے نتیجے میں ایک دوسرے کے خلاف زیادتیاں ہوں گی، حقوق پر ڈاکے پڑیں گے، اور جان و مال، عزت و آبرو، کسی چیز کی امان باقی نہ رہ جائے گی۔اس کا مطلب یہ ہے کہ جس اجتماعیت کو انسان نے اپنے دل کا سکون جان کر اور اپنی جائے پناہ سمجھ کر اپنایا ہوگا وہ اس کے لیے جان کا عذاب ثابت ہوگی۔ایسی حالت میں اس کے لیے منطقی طور پر دو ہی چارۂ کار ہو سکتے ہیں:

یا تو وہ اس اجتماعیت ہی سے توبہ کر لے۔

یا پھر ان مشکلات کا کوئی حل ڈھونڈے۔

پہلی راہ اختیار نہیں کر سکتا۔کیونکہ نہ تو اس کے فطری جذبات ہی اس کی اجازت دیں گے، نہ اس کی معاشی اور دفاعی مصلحتیں ہی اسے ایسا کرنے دیں گی۔اس لیے عملاً اس کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار باقی نہیں رہ جاتا کہ اس کے پاس ان مستقل اور انتہائی اہم مسائل کا کوئی مستقل اور مؤثر حل بھی ہو۔دوسرے لفظوں میں یہ کہ کوئی ایسا انتظام ہو جو خواہشوں کے ٹکراؤ اور مفادوں کی کش مکش کو قابو میں رکھے، کوئی ایسی طاقت ہو جو ظلم پر آمادہ ہاتھوں کو پکڑ لے، کمزوروں کو محفوظ رکھے، مظلوموں کی فریاد رسی کرے، اور حقوق واپس دلائے۔بغیر کسی بحث اور دلیل کے کہا جا سکتا ہے کہ حکومت اسی انتظام اور اسی طاقت کا دوسرا نام ہے۔یعنی یہ صرف حکومتی نظام ہی ہے جو کسی اجتماع کے اندر امن و انصاف کی فضا قائم کر سکتا اور برقرار رکھ سکتا ہے۔یہ ایک صاف اور فطری حقیقت ہے، اور اس کا انکار اس وقت تک نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ انسانی جبلت کے روشن ترین حقائق کی طرف سے آنکھیں نہ بند کر لی جائیں۔ابن خلدون نے کوئی مبالغہ نہیں کیا تھا جب

یہ کہا تھا کہ انسان جس طرح فطری طور پر اجتماعیت پسند واقع ہوا ہے اسی طرح عین اپنی فطرت ہی کی بنا پر ایک ایسے ''وازع'' اور ''حاکم'' کا ضرورت مند بھی ہے جو اجتماع کے مختلف افراد کو ایک دوسرے کے خلاف دست درازیاں کرنے سے روکے۔

پھر یہ حکومتی نظام کسی اجتماع اور معاشرے کی صرف داخلی ضرورت نہیں ہے، بلکہ اس کی خارجی ضرورت بھی ہے۔ اس کے بغیر وہ اپنے وجود اور اپنے مفادات کی ٹھیک ٹھیک حفاظت بالکل نہیں کرسکتا۔ کیونکہ انسانی جبلت کی کمزوریاں جس طرح ایک اجتماعی وحدت کے افراد کو ایک دوسرے کے خلاف آمادۂ ظلم کرتی رہتی ہیں، اسی طرح مختلف اجتماعی وحدتوں اور قوموں کو بھی آپس میں ٹکرایا کرتی ہیں، اور کوئی قوم اپنے خلاف جارحانہ اقدامات کی طرف سے کبھی مطمئن نہیں رہتی۔ ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ اس کے لیے اپنے دفاع کا انتظام رکھنا اس کا سب سے پہلا نہیں تو ایک اہم ترین فریضہ ضرور ہی ہوگا۔ یہ تو صحیح ہے کہ ضرورت پڑ جانے پر دفاع کا یہ فرض اس اجتماع کے افراد ہی انجام دیں گے، لیکن اگر اس سلسلے میں انھیں اپنی اپنی رائے اور اپنے اپنے انفرادی فیصلوں پر چھوڑ دیا گیا کہ جو شخص جب چاہے اور جس طرح مناسب سمجھے اپنے اس فرض کو انجام دے، تو کامیابی کی توقع رکھنا عبث ہی ہوگا۔ کسی بن سری فوج نے آج تک کسی منظم حملے کا مقابلہ نہیں کیا ہے۔ اس لیے افراد اپنی اپنی جگہ چاہے کتنے ہی فرض شناس، باحمیت اور جاں فروش کیوں نہ ہوں، اگر وہ کسی نظامِ امر و طاعت کے تحت نہ ہوں گے تو ہونے والے حملوں کا مؤثر دفاع ہرگز نہ کرسکیں گے۔ دوسرے لفظوں میں گویا حقیقت وہی نکلی کہ ہر اجتماع اپنے دفاع کے لیے ایک حکومتی نظم و نسق کا محتاج ہے۔ یاد ہوگا کہ یہ دفاعی مصلحت اور ضرورت بھی انھی بنیادی اسباب میں سے ایک ہے جو انسان کے لیے اجتماعیت کو لازم ٹھیراتے ہیں۔ اس لیے اس احتیاج کا مطلب یہ ہوا کہ حکومت کا قیام خود اجتماعیت کے اپنے مقصدِ وجود کی خاطر بھی ضروری ہے۔

اسلام اور نظامِ حکومت

مسلم معاشرہ بھی انسانی معاشرہ ہی ہوتا ہے، اور انھی انسانوں سے بنتا ہے جن کے اندر خیر

اور شر دونوں کی قوتیں کام کیا کرتی ہیں، اور جن کے دلوں میں فجور اور تقویٰ دونوں ہی کا ''الہام'' فرمایا گیا ہے۔ اس لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ شر اور فجور کے اثر سے بالکل پاک رہے۔ کیونکہ اپنی تمام تر خیر پسندیوں اور تقویٰ شعاریوں کے باوجود مسلمان بھی انسان ہی رہتے ہیں، مافوق الانسان نہیں ہو جاتے۔ اس لیے ان کے معاشرے میں بھی انسانی جبلت کی کمزوریاں ہمیشہ پائی جاسکتی ہیں، ہمیشہ پائی گئی ہیں، اور ہمیشہ پائی جاتی رہیں گی۔ اسلامی شریعت میں حدود اور تعزیرات کی جو ایک طویل فہرست موجود ہے اور فصل مقدمات کے بارے میں جو مفصل ہدایتیں پائی جاتی ہیں وہ اس بات کی ناطق دلیل ہیں کہ خود اسلام بھی اپنے پیروؤں کے بارے میں یہ تصور نہیں رکھتا کہ بدی اور ظلم کا ان کے قریب سے گزر نہ ہوگا، اور وہ ایک دوسرے کے خلاف کوئی غلط قدم نہ اٹھائیں گے۔ بلکہ وہ انھیں ٹھیک وہی انسان سمجھتا ہے جس کی جبلت خیر کے ساتھ ساتھ شر سے بھی وابستگی رکھتی ہے، اور جس سے ہمیشہ ہر غلطی صادر ہوسکتی ہے۔ اس لیے جس طرح دوسرے معاشروں کو حکومتی ادارے اور نظام کی ضرورت ہوتی ہے، تاکہ وہ اپنے افراد کے درمیان امن و انصاف قائم رکھ سکیں، ٹھیک اسی طرح یہ اسلامی معاشرہ بھی اس نظام سے بے نیاز نہ رہ سکے گا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ وہ اس کی ضرورت سب سے زیادہ محسوس کرے گا۔ کیونکہ انسان کے جانی اور مالی حقوق کو جو اہمیت اور حرمت اسلام نے عطا کر رکھی ہے، وہ کہیں اور شاید ہی پائی جاتی ہوگی۔

اب جہاں تک دفاعی ضرورت کا تعلق ہے، مسلم معاشرے کو یہ ضرورت بھی ٹھیک اسی طرح لاحق رہے گی جس طرح کہ کسی اور معاشرے کو ہوسکتی ہے۔ کیونکہ دنیا میں جب تک 'غیر اسلام' باقی ہے، مسلم معاشرے کے خلاف اقدامات کا اندیشہ ہر آن لگا رہے گا، اور رہ رہ کر عملی صورت بھی اختیار کرتا رہے گا۔ اس لیے اسے اپنی مؤثر حفاظت اور کام یاب مدافعت کے لیے بھی ایک حکومتی ادارے کا قائم رکھنا از بس ضروری ہے۔

غرض جس پہلو سے دیکھیے، یہ معاشرہ بھی ایک حکومتی ادارے کی ضرورت میں کسی سے کم نہیں ہے، اور اس کا قیام اس کی بھی ایک فطری طلب اور ناگزیر ضرورت ہی ہے۔

نظامِ خلافت کا شرعی وجوب

اس بحث سے مسلم معاشرے کے لیے ایک حکومتی ادارے کی ضرورت اگرچہ پوری طرح عیاں ہو جاتی ہے، لیکن ظاہر ہے کہ اس کی بنیاد تمام تر عقلی اور فکری ہے، حالانکہ گفتگو کسی انسانی نظامِ فکر کے بارے میں نہیں بلکہ دینی اور اسلامی تصورات کے بارے میں ہو رہی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس سلسلے میں شریعت کی اپنی وضاحت بھی معلوم کر لی جائے، اور فیصلہ کا اصل انحصار اسی پر رکھا جائے۔ ورنہ کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ ممکن ہے خود اسلام نے مسلم معاشرے کو اس نقطۂ نظر سے نہ دیکھا ہو جسے بنیاد بنا کر اس کے بارے میں یہ رائے قائم کی گئی ہے۔

اس غرض سے جب آپ شریعت کی طرف رجوع کریں گے تو پائیں گے کہ ایک حکومتی ادارے کے قیام کے متعلق قرآن اور حدیث کی ہدایتیں، اسوۂ رسولؐ اور اسوۂ صحابہ کی شہادتیں، اور علمائے اسلام کی صراحتیں، سب کچھ موجود ہیں:

(۱) جہاں تک قرآن حکیم کا تعلق ہے، اس کا حال یہ ہے کہ ایک طرف تو اس نے مسلمانوں کو اپنے 'اولی الامر' یعنی امرا و حکام کی اطاعت کا حکم دے رکھا ہے:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ. (النساء:۵۹)

دوسری طرف ان پر ایسے بہت سے قوانین کے نفاذ کی ذمہ داری ڈال رکھی ہے جن کو ایک حکومتی ادارے کے بغیر نافذ کیا ہی نہیں جا سکتا، مثلاً قاتل کو موت کی سزا دینا، چور کا ہاتھ کاٹ لینا، زانی کو سنگسار کرنا یا تازیانے لگانا وغیرہ۔ یہ دونوں باتیں اپنی اپنی جگہ اس امرِ واقعی کا اعلان ہیں کہ قرآن کے نزدیک مسلم معاشرہ قطعی طور پر ایک باحکومت معاشرہ ہے، وہ ایک حکومتی نظام کے تصور کے بغیر مسلم معاشرے کا کوئی تصور نہیں رکھتا، یا کم از کم یہ کہ رکھنا نہیں چاہتا۔ بلاشبہ وہ اس طرح کے الفاظ تو نہیں استعمال کرتا کہ اے اہل ایمان! تم اپنا ایک حکومتی نظام قائم کرو اور قائم رکھو۔ مگر اس کی وجہ اس ایک بات کے سوا اور کچھ نہیں کہ ایسا کرنا بالکل غیر ضروری تھا۔ ایک بجائے خود واضح اور طے شدہ حقیقت کے بارے میں خواہ مخواہ کا اعلان و اظہار تھا۔ آخر جہاں دھوپ اور

تمازت کی باتیں ہو رہی ہوں وہاں سورج کے وجود کی صراحت کا کیا سوال باقی رہ جاتا ہے؟
مسلمانوں سے اپنے امرا و حکام کی اطاعت کا مطالبہ کرنا اور انھیں مجرموں کے خلاف ایک حکومت کے سے اقدامات کا ذمہ دار ٹھیرانا اپنی جگہ اس بات کی خود ہی سب سے بڑی صراحت ہے کہ وہ ایک حکومتی نظام کے تحت زندگی بسر کرنے والے ہوتے ہی ہیں، یا یہ کہ انھیں ایسا ہونا ہی چاہیے۔ چنانچہ امام فخر الدین رازیؒ ان آیتوں میں سے جن میں مسلمانوں پر ایک حکومت کے سے اقدامات کی ذمہ داریاں ڈالی گئی ہیں، ایک آیت: وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا۔ (المائدہ:۳۸) کی تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

احتج المتكلمون بهذه الاية في انّه' يجب على الامة ان ينصبوا لانفسهم اماما معينا والدليل عليه انه تعالٰى اوجب بهذه الآية اقامة الحد على السراق و الزناة فلابد من شخص يكون مخاطبا بهذا الخطاب و اجمعت الامة علٰى انه لَيس لآحاد الرعية اقامة الحدود علٰى الجناة بل اجمعوا علٰى انه لا يجوز اقامة الحدود على الاحرار الجناة الا للامام، فلما كان هذا التكليف تكليفا جازما ولم يمكن الخروج عن عهدة هٰذا التكليف الا عند وجود الامام وما لا يتاتى الواجب الابه و كانَ مقدور المكلف فهو واجب فلزم القطع بوجوب نصب الامام حينئذ.

(تفسیر کبیر، جلد ۳، صفحہ ۴۱۵)

''علمائے متکلمین نے اس آیت کو اس بات کا ثبوت قرار دیا ہے کہ امت کے لیے اپنا ایک متعین امام (حکمران) مقرر کر لینا واجب ہے۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے ذریعے سے چوروں اور زانیوں پر حد جاری کرنا واجب ٹھیرایا ہے۔ اس لیے ایک ایسے شخص کا ہونا ضروری ہے جو اس فرمانِ خداوندی کا راست مخاطب (اور اس کی تعمیل کا ذمہ دار) ہو۔ ادھر امت کا اس بات پر اجماع ہے کہ عام افراد و اشخاص کو مجرموں پر حدیں جاری کر دینے کا حق حاصل نہیں ہے۔ بلکہ جہاں تک آزاد مجرموں کا تعلق ہے،

ان پر حد جاری کرنے کے بارے میں تو اس بات پر اجماع ہے کہ امام کے سوا اور کسی کے لیے وہ قطعاً جائز ہی نہیں۔ اب جب کہ حدیں جاری کرنے کی ذمہ داری ایک قطعی اور لازمی ذمہ داری ہے، اور اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونا ایک امام کے بغیر ممکن ہی نہیں، اور یہ بھی ایک واضح حقیقت ہے کہ جس شے پر کسی امرِ واجب کی تعمیل منحصر ہو اور وہ حدِ استطاعت سے باہر بھی ہو، وہ خود بھی واجب ہو جاتی ہے ——— تو ایسی حالت میں امام کے تقرر کا واجب ہونا بالکل قطعی ہو جاتا ہے۔''

(۲) اب رہا احادیث کا معاملہ، تو اس طرح کی متعدد حدیثیں کتاب کے پہلے باب میں آپ پڑھ چکے ہیں جو مسلم معاشرے کے لیے ایک حکومتی نظام کی ضرورت پر روشنی ڈالتی ہیں۔ یاد تازہ کرنے کے لیے ان میں سے دو خاص حدیثوں پر پھر سے نظر ڈال لیجیے:

(الف) مَنْ مَّاتَ وَلَيْسَ فِيْ عُنُقِهٖ بَيْعَةٌ مَاتَ مِيْتَةً جَاهِلِيَّةً. (مسلم جلد دوم۔ صفحہ ۱۲۸)

''جو کوئی اس حال میں مر گیا ہو کہ اس کی گردن (خلیفۃ المسلمین کی) بیعت (کے قلادے) سے خالی ہو اس کی موت جاہلیت کی موت ہوگی۔''

(ب) اٰمُرُكُمْ بِخَمْسٍ بِالْجَمَاعَةِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَالْهِجْرَةِ والْجِهَادِ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ. (احمد و ترمذی بحوالہ مشکوٰۃ، صفحہ ۳۲۱)

''میں تمھیں پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں: جماعتی زندگی کا، سمع (احکام سننے) کا، اطاعت (احکام ماننے کا)، ہجرت کا، اور جہاد فی سبیل اللہ کا۔''

ایک حکومتی ادارے کی ضرورت کے بارے میں پہلی حدیث کا انداز کچھ اسی قسم کا ہے جیسا کہ قرآن مجید کا ابھی آپ دیکھ چکے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ بیعتِ خلافت سے محرومی انسان کو جاہلیت کی حالت میں پہنچا دیتی ہے، صراحتاً یہ معنی رکھتا ہے کہ مسلم معاشرہ نظامِ خلافت کے بغیر ہوتا ہی نہیں، یا کم از کم یہ کہ اسے ہرگز ایسا نہ ہونا چاہیے۔ اور جب حقیقت یہ ٹھیری تو یہ گویا اس بات کا اعلان و اظہار ہے کہ اس نظام کا قائم کرنا اور قائم رکھنا اس معاشرے کی ایک

لازمی اور فطری ذمہ داری ہے۔ کیونکہ اس عالم اسباب میں کوئی نظام حکومت آپ سے آپ قائم نہیں ہوا کرتا، بلکہ کسی انسانی گروہ کی کوششوں ہی سے قائم ہوا کرتا ہے۔ اس لیے مسلم معاشرہ بھی اس وقت تک 'باحکومت' نہیں ہوسکتا جب تک وہ خود اس کی ذمہ داری محسوس نہ کرے اور اس کے لیے ضروری کوششیں انجام نہ دے۔

رہی دوسری حدیث، تو ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ اس بارے میں اس کی حیثیت صاف طور پر واضح اور راست ہدایت کی ہے۔ کیونکہ اس میں ایک ایسی اجتماعی زندگی بسر کرنے کا صریح حکم دیا گیا ہے جو کوئی معمولی قسم کی نہیں بلکہ 'سمع' اور 'طاعت' والی اجتماعی زندگی ہے، یعنی ایک ایسی زندگی جس میں احکام جاری ہوتے ہوں، جس کے اندر کوئی حکم دینے والا ہو اور لوگ اس کی طاعت کرنے والے ہوں۔ صاف لفظوں میں یہ کہ جو ایک 'نظامِ امر و طاعت' یا ایک 'حکومتی ادارہ' رکھنے والی اجتماعی زندگی ہو۔ کیوں کہ 'سمع و طاعت' کا وجود کسی نہ کسی طرح حکومت کے وجود ہی پر موقوف ہے۔ جہاں حکومت نہ ہو وہاں اس 'سمع و طاعت' کا بھی کوئی سوال باقی نہ رہ جائے گا۔ چنانچہ یہ دونوں الفاظ احادیث میں کثرت سے استعمال ہوئے ہیں، اور قریب قریب ہر جگہ ان سے مراد اُمرا و حکام کی اطاعت ہی ہے۔

(۳) اسوۂ رسولؐ کا حال اس باب میں ساری دنیا پر روشن ہے۔ آپؐ معناً تو ابتدا ہی سے صاحب امر و حکم تھے، مگر ہجرت کے بعد تو آپ کی یہ حیثیت ظاہری اور اصطلاحی طور پر بھی پوری طرح نمایاں ہوگئی، اور پھر آخر دم تک نمایاں سے نمایاں تر ہی رہی۔ سارے اہلِ ایمان ایک قوم، ایک ملت اور ایک جماعت تھے اور آپؐ اس کے قائد و سربراہ تھے۔ پورا اسلامی خطۂ ارض ایک مملکت تھا، اور آپؐ اس مملکت کے حکمران تھے۔ غرض ایک اسٹیٹ اور ایک گورنمنٹ کا جو مفہوم ہوتا ہے وہ مسلم آبادی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل میں پوری طرح موجود پایا گیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپؐ کی مدنی زندگی کا لمحہ لمحہ اس بات کا گواہ ہے کہ اسلام کے ساتھ، مسلم معاشرے کے ساتھ، منصب رسالت کے ساتھ ایک ریاست اور حکومت کا تصور معنیٰ و حقیقت کی حد تک تو ہر وقت، اور

عملی طور پر بشرطِ امکان، لازماً وابستہ ہے۔ ورنہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اللہ کے رسولؐ نے ایک ایسا کام کیا اور پیہم کیا، جس کا اللہ کے دین سے کوئی تعلق نہ تھا، ایک ایسی حیثیت اختیار کی اور مسلسل اختیار کیے رکھی، جو نبوت کے تقاضوں میں شامل نہ تھی۔ لیکن ظاہر ہے کہ ایسا خیال کرنا کسی اور کے لیے ممکن ہوتو ہو، ان لوگوں کے لیے کسی طرح ممکن نہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا رسول مانتے ہیں۔

(۴) اسوۂ صحابہ جو کچھ اس مسئلے میں رہا ہے، اس کی ضروری تفصیل یہ ہے:

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو حضرات صحابۂ کرامؓ نے جس کام کو سب سے اہم سمجھا اور جس ہر دوسرے کام پر مقدم رکھا، وہ خلیفۂ رسولؐ کا انتخاب اور نظمِ خلافت کا قیام تھا۔ حتیٰ کہ تدفین کے فریضے کو بھی مؤخر رکھا گیا۔ نعش مبارک رکھی رہی۔ جب خلیفہ کا انتخاب ہو گیا، تب جا کر اسے دفن کیا گیا۔ صحابہ کا یہ طرزِ عمل نہ اختلافی تھا نہ ہنگامی، بلکہ اجماعی بھی تھا اور مستقل بھی۔ یعنی انہوں نے ایسا پورے اتفاق رائے سے کیا، اور پھر بعد میں بھی ہمیشہ ایسا ہی کیا۔ جب کسی خلیفہ کا انتقال ہوا تو اس وقت تک اُسے دفن کرنے کے فریضے کی طرف متوجہ نہ ہوئے جب تک کہ اس کے جانشین کا انتخاب نہ کر لیا۔ (شرح عقائد نسفیہ صفحہ ۱۱۰) صحابہ کرام کا یہ متفقہ اور مستقل طرزِ عمل نظم حکومت کی ضرورت و اہمیت کے بارے میں ان کے جس شدید احساس کا مظہر ہے، وہ شاید ہی اپنی کوئی نظیر رکھتا ہو۔ یہ ان حضرات کا اس بات پر غیر مشکوک اجماع تھا کہ مسلم معاشرہ ایک امام و خلیفہ، دوسرے لفظوں میں ایک حکومتی ادارے سے ہرگز خالی نہیں رہ سکتا۔ دینی حیثیت سے یہ ایک ناقابل قبول صورت حال ہے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے وفاتِ رسولؐ کے بعد صحابہ کرامؓ کے اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

الا ان محمدا قد مات ولا بد لهذا الدين ممن يقوم به.

(کتاب المواقف وشرحہ، جلد ۸ صفحہ ۳۴۶)

"آگاہ! حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا گئے ہیں، اور اب اس دین کے لیے ایک ایسا شخص

بہر حال ضروری ہے جو اس (کے قیام ونفاذ) کا ذمہ دار رہے۔"

آں جناب کا منشا ان لفظوں سے واضح طور پر ایک خلیفہ کے انتخاب وتقرر کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ یہ بات صحابہ کے بھرے مجمع میں کہی گئی تھی، اور ایک زبان بھی ایسی نہ تھی جس نے اس کے صحیح اور برحق ہونے سے انکار کیا ہو۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ:

لا اسلام الا بالجماعة و لا جماعة الابامارة. (جامع بیان العلم)

"جماعت کے بغیر اسلام نہیں، اور امارت کے بغیر جماعت، جماعت نہیں۔"

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف جب خوارج نے **لاحکم الا للّٰہ** کا نعرہ لگایا تو آپ نے فرمایا:

انما یقولون لا امارة و لا بد من امارة برة اوفاجرة.

(الملل والنحل للشہرستانی جلد اول، صفحہ ۵۵)

"ان کا کہنا تو یہ ہے کہ کوئی امارت (اور حکومت) ہونی ہی نہ چاہیے، حالانکہ امارت بہر حال ضروری ہے، چاہے وہ اچھی ہو چاہے بُری۔"

رسولؐ خدا کے ان معیاری جانشینوں اور دینِ حق کے ان بہترین ترجمانوں کے یہ ارشادات آپ کے سامنے ہیں۔ ان پر نظر ڈالیے، اور پھر سوچیے کہ کیا کوئی لفظ ایسا ہوسکتا ہے جو ایک حکومتی ادارے کو دین وملت کی ایک ناگزیر ضرورت ظاہر کرنے کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہو اور وہ ظاہراً یا معناً، ان میں استعمال نہ کیا گیا ہو؟

جس حکومتی نظام کی ضرورت پر قرآن مجید، حدیث شریف، اسوۂ رسول اور اقوال و اعمال صحابہ، سب کی شہادتیں موجود ہوں، اور ایسے واضح اور قطعی انداز کی موجود ہوں، علمائے شریعت اس کے بارے میں اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے تھے کہ مسلم معاشرے کی یہ ایک لازمی ضرورت ہے اور اس نظام کا قائم کرنا اور قائم رکھنا اس کے دینی فرائض میں شامل ہے۔ چنانچہ قاضی ماوردی لکھتے ہیں:

عقدها لمن یقوم بما فی الامة واجب بالاجماع. (الاحکام السلطانیہ: ص ۳)

"امامت (یعنی خلافت) کا، ایک ایسے شخص کے لیے انعقاد، جو امت کے اندر اس کی

ذمہ داریوں کو پورا کر سکے، بالا جماع واجب ہے۔"

اسی طرح علامہ تفتازانی شرح عقائد نسفیہ میں فرماتے ہیں کہ:

الاجماع علٰی ان نصب الامام واجب. (صفحہ ۱۱۰)

"اس بات پر اجماع ہے کہ امام (یعنی خلیفہ) کا تقرر واجب ہے۔"[1]

یعنی امت کے لیے اپنا ایک حکومتی نظام قائم کرنا شرعاً واجب ہے۔ اگر وہ اپنے اس فریضے سے عہدہ برآ نہیں ہوتی تو یہ ایک اجتماعی معصیت ہوگی، جس کے لیے اسے اللہ کے حضور جواب دہ ہونا پڑے گا۔

آگے اس وجوب کی دلیلیں بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

ولان کثیرا من الواجبات الشرعیة یتوقف علیه. (ایضاً)

"اور اس لیے کہ بہت سے شرعی واجبات کا ادا ہونا اسی (امامت) پر موقوف ہے۔"

اور دراصل یہ واجبات شرعیہ کی ادائی ہی وہ سب سے بنیادی غرض اور ضرورت تھی جس کی بنا پر رسولؐ نے وہ کچھ کیا اور فرمایا ہے جو اوپر کی سطروں میں مذکور ہے۔ جس نظامِ حکومت کے بغیر دین کے کثیر التعداد واجبات ادا ہو ہی نہیں سکتے، کیسے ممکن ہے کہ وہ تو موجود نہ ہو، مگر دین صحیح معنوں میں موجود ہو؟ ماننا ہی پڑے گا کہ حکومتی نظام کے بغیر اسلام اپنی صحیح اور کامل شکل میں کبھی نمودار نہیں ہوسکتا، اور عقل عام یہ کہنے پر مجبور ہوگی کہ جس 'اسلام' کے پاس حکومت اور نظام حکومت نہ ہو، اس کی حیثیت ٹھیک ایک لنگڑے لولے اور اپاہج جسم کی سی ہے۔ ایسے جسم کو اگرچہ مردہ لاش نہ کہا جائے گا، مگر ایک تندرست اور کارآمد وجود بھی نہ قرار دیا جاسکے گا، اور نہ کبھی اس سے وہ کارنامے انجام پاسکیں گے جو تندرست اور صحیح الاعضا جسموں ہی سے متوقع ہوتے ہیں۔

---

[1] اس اجماع میں خارجیوں کے ناقابلِ ذکر گروہ کے سوا سبھی لوگ شریک ہیں۔ البتہ فرقہ امامیہ اور فرقہ اسماعیلیہ کا خیال یہ ہے کہ امام کا تقرر واجب تو ہے مگر خلق کے ذمے نہیں، بلکہ خدا کے ذمے۔ خوارج کے نزدیک امام کا تقرر اور نظام حکومت کا قیام صرف جائز ہے، واجب نہیں ہے (کتاب المواقف وشرحہ، جلد ۸، صفحہ ۳۴۵)۔ لیکن یہ دونوں طرح کے خیالات، عملی، عقلی اور شرعی ہر حیثیت سے اتنے پوچ ہیں کہ ان کی تردید کی بھی ضرورت نہیں۔

اسلام اور حکومتی نظام کا یہ لازمی تعلق صرف اسی 'اسلام' تک محدود نہیں ہے، اور نہ اصولاً ہوسکتا ہے، جسے قرآن اور نبی آخرالزماں نے پیش فرمایا ہے، بلکہ ہر 'اسلام' اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والے ہر دین تک اس کا دائرہ وسیع ہے۔ چنانچہ اُمتِ مسلمہ کی پیش رو اُمت (بنی اسرائیل) کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ

كَانَتْ بَنُوْ اِسْرَائِيلَ تَسُوْسُهُمُ الْاَنْبِيَاءُ كُلَّمَا هَلَكَ نَبِيٌّ خَلَفَهُ نَبِيٌّ.

(مسلم کتاب الامارة)

''بنی اسرائیل کا نظام و نسق ان کے انبیا چلاتے تھے۔ جب ایک نبی وفات پا جاتا تو اس کی جگہ دُوسرا نبی مبعوث ہوجاتا۔''

اس ''نظم و نسق'' کی مختلف اوقات میں چاہے بظاہر جو شکلیں بھی رہی ہوں، لیکن اتنی بات تو تسلیم ہی کرنی پڑے گی کہ ہر حال میں وہ حقیقتاً ایک حکومتی نظام ہی ہوتا تھا، البتہ اس کی معیاری اور مکمل شکل وہ تھی جو حضرت داوٗد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کے دَور میں پائی گئی۔ اس حدیث کے اندازِ بیان کو ذرا غور سے دیکھیے۔ اس سے صرف یہی نہیں معلوم ہوتا کہ ملت اسرائیل میں عموماً حکومتی نظم و نسق برابر قائم رہا کرتا اور براہ راست اس کے نبیوں کے فرائض میں داخل ہوا کرتا تھا، بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام ان انبیا کے مقصد بعثت تک میں شامل رہا کرتا تھا۔ یہ نکتہ، دین کے لیے سیاست کی، اور اہل دین کے لیے حکومتی نظام کی ضرورت کو روشن تر کر دیتا ہے۔

خلافت کے فرائض

جس شخص کا خلافت کے منصب پر تقرر ہوگا، اس کا کام عام حکمرانوں سے بہت وسیع اور بہت مختلف ہوگا۔ یہ منصب اول و آخر ایک شرعی منصب ہے اور شریعت نے اپنے متعینہ مقصد ہی کی خاطر اسے قائم کیا ہے۔ اس لیے خلیفہ کا فرض یہ ہوگا، اور صرف یہی ہوگا کہ وہ اس مقصد کو پورا کرے۔ یہ مقصد دو لفظوں میں 'اللہ کے دین کا قیام' ہے۔ جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد ارشادات سے واضح ہوتا ہے۔ مثلاً آپؐ فرماتے ہیں کہ:

اِنْ اُمِرَ عَلَيْكُمْ عَبْدٌ مُجَدَّعٌ يَقُوْدُكُمْ بِكِتَابِ اللّٰهِ فَاسْمَعُوْا لَهٗ وَاَطِيْعُوْا.

(مسلم، کتاب الامارۃ)

''اگر کوئی ایسا غلام بھی تمھارا امیر بنا دیا جائے جس کے اعضا کٹے ہوئے ہوں، لیکن وہ قانون الٰہی کے مطابق تمھاری سرداری کرے، تو اس کی سنو اور اطاعت کرو۔''

ایک اور موقع پر ارشاد ہوتا ہے کہ:

اِنَّ هٰذَا الْاَمْرَ فِیْ قُرَيْشٍ لَا يُعَادِيْهِمْ اَحَدٌ اِلَّا كَبَّهُ اللّٰهُ عَلٰى وَجْهِهٖ مَا اَقَامُوا الدِّيْنَ. (بخاری، کتاب الاحکام)

''یہ چیز (یعنی خلافت) قریش میں رہے گی۔ جو شخص اس معاملے میں ان کے خلاف محاذ آرائی کرے گا، اللہ تعالیٰ اسے منہ کے بل گرا دے گا، جب تک کہ وہ دین کو قائم رکھیں۔''

ان حدیثوں کے دیکھنے کے بعد اس حقیقت پر کوئی پردہ نہیں رہ جاتا کہ کوئی امیر عوام کی فرماں برداری کا، اور کوئی خلیفہ خلافت کے اقتدار کا واقعی حق دار اسی وقت تک باقی رہتا ہے جب تک کہ وہ شریعت کے قوانین اور مصالح کے تحت اپنے فرائض انجام دے، اور اللہ کے دین کو قائم رکھے۔ اور یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ کسی منصب کا حق دار باقی رہنا جس چیز پر موقوف ہوا کرتا ہے، وہ صرف وہ فریضہ اور مقصد ہوتا ہے جس کی خاطر یہ منصب قائم کیا گیا ہوتا ہے۔ اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات کا کھلا ہوا مطلب یہ ہوا کہ منصب خلافت کے قیام کی غرض و غایت، اور خلیفہ کا فرضِ منصبی صرف اقامتِ دین ہے۔

پھر حضرت ابوبکر صدیقؓ کا یہ فقرہ ابھی ہمارے سامنے آچکا ہے کہ:

''آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا گئے، اور اب اس دین کے لیے ایک ایسے شخص کی بہرحال ضرورت ہے جو اس کے (قیام و نفاذ) کا ذمہ دار ہو۔''

یہ فقرہ جو دراصل صرف ایک حضرت ابوبکر صدیقؓ ہی کا نہیں بلکہ پورے گروہ صحابہؓ کا فقرہ تھا، اس بات کا صریح اعلان ہے کہ خلیفہ کا وجود اگر مطلوب ہے تو صرف اللہ کے دین کو قائم رکھنے کے لیے۔ اور یہی وہ فریضہ ہے جسے اسے انجام دینا ہوتا ہے۔ ان حقائق کی موجودگی میں علما نے بجا

طور پر 'امامت' (یعنی خلافت) کی تعریف ہی ان لفظوں میں کی ہے:

ھی خلافۃ الرسول فی اقامۃ الدین. (کتاب المواقف)

''امامت نام ہے دین کی اقامت کے معاملہ میں رسولؐ خدا کی جانشینی کا۔''

'دین کی اقامت' کا مفہوم اتنا ہی وسیع اور ہمہ گیر ہے جتنا کہ خود 'دین' کا مفہوم۔ کتاب و سنت میں جتنے احکام ہیں، وہ سب کے سب 'دین' ہیں۔ اس لیے 'دین کی اقامت' کا مطلب یہ ہوا کہ مسلم معاشرے سے اس پورے مجموعے کے تحت زندگی بسر کرائی جائے۔ اس اجمال کی پوری تفصیل ظاہر ہے کہ بڑی طوالانی ہوگی، جس کا نہ یہاں کوئی موقع ہے اور نہ کوئی ضرورت۔ البتہ اس کے بنیادی نکات ضرور معلوم کر لینے چاہییں، تاکہ خلیفہ کے فرائض کا ایک خاکہ سامنے آ جائے۔ اس غرض کے لیے اگر آپ ان اسباب و مصالح پر پھر سے نظر ڈال لیں جن کی بنا پر شریعت نے اس منصب کا قائم کرنا ضروری قرار دیا ہے، تو ان نکات کا تعین کچھ اس طرح پر ہوگا:

۱۔ دین کی علمی و نظری حفاظت، دینی علوم کی نشر و اشاعت اور مسلمانوں میں دینی یقین کی بقا و ترقی کا اہتمام۔

۲۔ دین کی عملی بنیادوں (نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج) کو قائم رکھنا اور معاشرے میں ان کی طرف سے غفلت نہ پیدا ہونے دینا۔

۳۔ دین و ملت کا دشمنوں سے دفاع کرنا، اور اس غرض کے لیے جنگ و جہاد کے جملہ فرائض انجام دینا۔

۴۔ معاملات کا فیصلہ اور عدل کا قیام۔

۵۔ مجرموں پر سزاؤں کا نفاذ۔

۶۔ افرادِ معاشرہ کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت، اور امن و امان کا قیام۔

۷۔ اندرونِ معاشرہ بھی اور بیرونِ معاشرہ بھی، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا پورا پورا اہتمام۔

اگر آپ چاہیں تو مزید نکات کے بھی نام لے سکتے ہیں۔ چنانچہ بعض علما نے فرائضِ خلافت

کی تعداد اس سے زیادہ بتائی ہے۔ مگر حق یہ ہے کہ اس ضمن میں جن دوسری چیزوں کا نام لیا جا سکتا ہے وہ یا تو انھی آٹھوں میں سے کسی کے اندر شامل ہوں گی، یا پھر ان کی نوعیت بنیادی نکات کی نہ ہوگی۔

خلافت کے حقوق

خلافت یا خلیفۃ المسلمین کے فرائض جتنے وسیع اور ہمہ گیر ہیں، اس کے حقوق بھی اتنے ہی عظیم ہیں۔ دنیا کی کوئی بھی دوسری حکومت اور حکمراں شخصیت وہ حقوق نہیں رکھتی جو اسے حاصل ہوتے ہیں۔ ان حقوق کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ اطاعت: سب سے پہلا حق تو یہ ہے کہ اس کے احکام سنے اور مانے جائیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ:

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ امَنُوْا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِى الْاَمْرِ مِنْكُمْ. (النساء:۵۹)

''اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسولؐ کی، نیز اپنے میں کے اصحابِ امر کی۔''

اس آیت میں 'اصحابِ امر' کی اطاعت کا، جن میں خلیفۃ المسلمین بداہتاً سرفہرست ہے، واضح حکم دیا گیا اور اسے اہلِ ایمان کے لیے ضروری ٹھیرایا گیا ہے۔ اس طرح ضروری کہ اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کے حکم کے پہلو ہی میں یہ حکم بھی ثبت کر دیا گیا ہے۔ اس اندازِ کلام کا جو تقاضا ہے وہ اہلِ نظر پر مخفی نہیں رہ سکتا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی تقاضے کی شرح فرمائی تھی جب یہ ارشاد ہوا تھا کہ:

مَنْ اَطَاعَنِىْ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ وَمَنْ يَّعْصِنِىْ فَقَدْ عَصَى اللّٰهَ وَمَنْ يُّطِعِ الْاَمِيْرَ فَقَدْ اَطَاعَنِىْ وَمَنْ يَّعْصِ الْاَمِيْرَ فَقَدْ عَصَانِىْ. (مسلم جلد:۲)

''جس نے میرا حکم مانا اس نے دراصل اللہ کا حکم مانا، اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے دراصل اللہ کی نافرمانی کی، اور جس نے اپنے امیر کا حکم مانا اس نے دراصل میرا حکم مانا، اور جس نے امیر کی نافرمانی کی اس نے دراصل میری نافرمانی کی۔''

جو اطاعت، فی الواقع اللہ و رسولؐ کی اطاعت بن جاتی ہو، وہ افراد کی اپنی مرضی اور سہولت پر موقوف نہیں رہ سکتی۔ اس کا تو حق ہوگا کہ اسے اشخاص کی طبعی آمادگیوں سے یکسر بلند رکھا جائے۔

چنانچہ ایسا ہی کیا گیا ہے۔ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:

وَعَانَا النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نَبَایَعْنَا فَکَانَ فِیْ مَا اَخَذَ عَلَیْنَا اَنْ بَایَعْنَا عَلَی السَّمْعِ وَالطَّاعَۃِ فِیْ مَنْشَطِنَا وَمَکْرَھِنَا وَعُسْرِنَا وَیُسْرِنَا. الخ

(مسلم، کتاب الامارۃ)

''ہمیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بلایا اور آپؐ سے ہم نے بیعت کی تو ان باتوں میں جن کا ہم سے آپؐ نے عہد لیا، یہ بات بھی شامل تھی کہ ہم ہر حال میں، چاہے ہمیں گوارا ہو یا ناگوار، ہم تنگی کے عالم میں ہوں یا کشادگی کے عالم میں، اپنے امرا کے احکام سنیں گے اور ان کی اطاعت کریں گے۔''

پھر صرف یہی نہیں کہ طبیعت کی ناگواری اور تنگی و پریشان حالی کے وقت بھی سمع و طاعت ایک مسلمان کا فرض ہے، بلکہ یہ فرض اس وقت بھی اپنی جگہ جوں کا توں برقرار رہتا ہے جب یہ حکم دینے والے بے کرداری کے شکار ہوں، اور حقوق کے مواقع پر انھیں اپنی ذات سب سے پہلے یاد آتی ہو۔ چنانچہ مذکورہ حدیث اطاعت میں آگے یہ الفاظ بھی آتے ہیں:

وَاَثَرَۃٍ عَلَیْنَا۔

''اور اس وقت بھی ایسا ہی کریں گے جب ہمارے خلاف ترجیح برتی جا رہی ہو۔''

اور بات اب بھی اپنی حد کو نہیں پہنچی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانا تو یہاں تک ہے کہ:

تَسْمَعُ وَتُطِعُ وَاِنْ ضُرِبَ ظَھْرُکَ وَاُخِذَ مَالُکَ فَاسْمَعْ وَاَطِعْ.

(مسلم، کتاب الامارۃ)

''تمھیں (امرا کے حکموں کو) سننا اور ماننا چاہیے۔ حتیٰ کہ اگر تمھاری پیٹھ زخمی کر دی جائے اور تمھارا مال چھین لیا جائے تو بھی سنتے اور مانتے رہنا۔''

یہ، اور اسی طرح کی متعدد حدیثیں مسلمانوں کو تلقین کرتی ہیں کہ وہ اپنے خلاف سب کچھ جھیلتے رہیں، مگر سمع و طاعت کے دامن کو ہرگز نہ چھوڑیں۔ جب تک ایک شخص امارت یا خلافت کے منصب پر فائز ہے، اس کی اطاعت کا حق ناقابلِ انکار ہے، اور مسلمان کا فرض ہے کہ اس حق کو

برابر تسلیم کرتا رہے۔ اس کی بے کرداری اور اس کی بے انصافی اور ستم کوشی بھی اس کے اس حق کو ساقط نہیں کرسکتی۔

یہ 'حق' کتنی اہمیت رکھتا ہے، اور اس کا انکار مسلمان کو کہاں پہنچا دیا کرتا ہے؟ اس کا اندازہ ذیل کی حدیثوں سے لگایئے:

مَنْ خَلَعَ يَدًا مِنْ طَاعَةٍ لَقِيَ اللّٰهَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا حُجَّةَ لَه'. (مسلم، کتاب الامارۃ)

''جس نے اطاعت سے ہاتھ کھینچ لیا وہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے سامنے اس حال میں حاضر ہوگا کہ اس کے پاس (اپنی روش کے حق ہونے پر) کوئی دلیل نہ ہوگی۔''

معلوم ہوا کہ امراو خلفا کی نافرمانی کا معاملہ ایسا نہیں ہے جو یہیں ختم ہو جاتا ہو، بلکہ ایسا ہے جو کل خدا کے حضور بھی پیش ہوگا۔ اور جب پیش ہوگا تو وہاں اس جرم کی صفائی میں کوئی بات نہ کہی جاسکے گی۔ آدمی کو اقراری مجرم بننے کے لیے مجبور ہونا پڑے گا۔

ایک اور موقع پر ارشاد ہوتا ہے:

مَنْ رَاٰى مِنْ اَمِيْرِهٖ شَيْئًا يَكْرَهُهٗ فَلْيَصْبِرْ عَلَيْهِ فَاِنَّه' مَنْ فَارَقَ الْجَمَاعَةَ شِبْرًا فَمَاتَ اِلَّا مَاتَ مِيْتَةً جَاهِلِيَّةً۔ (بخاری، کتاب الفتن)

''جو کوئی اپنے امیر کے ہاتھوں کوئی ناگوار حرکت سرزد ہوتے دیکھے، اسے چاہیے کہ صبر کرے (اور اس کی وجہ سے اس کی اطاعت سے منہ موڑ لینے کی ہرگز نہ سوچے)، کیونکہ جو شخص بالشت برابر بھی جماعت سے الگ ہو رہے گا وہ جاہلیت کی حالت میں مرے گا۔''

یہ حدیث جہاں ایک طرف اُس حقیقت پر ایک نئے انداز سے روشنی ڈالتی ہے جو پہلی حدیث سے معلوم ہوئی تھی، وہیں دوسری طرف یہ بھی بتا دیتی ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ یہ کہتی ہے کہ خلیفۃ المسلمین کی حیثیت اسلامی اجتماعیت اور ملی تنظیم کے نشان کی ہوتی ہے، اس لیے اس کی اطاعت سے انکار صرف ایک فرد کی اطاعت کا انکار نہیں ہوتا، بلکہ دراصل اس پوری اجتماعی تنظیم سے علیحدگی کا اعلان ہوتا ہے۔ اور یہ ایک ایسا خطرناک اقدام ہے جس کے بعد خود مسلمان ہونے

کا دعویٰ بھی بے وزن ہو کر رہ جاتا ہے۔ آدمی اپنی تمام تر دین داریوں کے باوجود جب مرتا ہے تو ایک طرح کی جاہلی موت مرتا ہے۔ بلکہ بعض احادیث سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید وہ کُلّی جاہلیت کی موت مرتا ہے۔ چنانچہ یہ تنبیہ ہماری نظروں سے گزر بھی چکی ہے کہ:

مَنْ خَرَجَ مِنَ الْجَمَاعَةِ قِيْدَ شِبْرٍ فَقَدْ خَلَعَ رِبْقَةَ الْإِسْلَامِ مِنْ عُنُقِهٖ إِلَّا أَنْ يُّرَاجِعَ. (مشکوٰۃ، بحوالہ ترمذی)

"جو کوئی جماعت سے بالشت برابر بھی الگ ہو رہا اس نے اپنی گردن سے اسلام کا حلقہ نکال پھینکا، اِلّا یہ کہ وہ جماعت کی طرف پھر لوٹ آئے۔"

۲۔ محبت: خلافت کا حق یہ بھی ہے کہ صاحب امر سے محبت رکھی جائے۔ جس طرح ظاہر میں اس کے احکام کی اطاعت ہو، اسی طرح دلوں میں اس کی ذات کے لیے جگہ موجود ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ:

خِيَارُ اَئِمَّتِكُمُ الَّذِيْنَ تُحِبُّوْنَهُمْ وَيُحِبُّوْنَكُمْ وَتُصَلُّوْنَ عَلَيْهِمْ وَيُصَلُّوْنَ عَلَيْكُمْ وَشِرَارُ اَئِمَّتِكُمُ الَّذِيْنَ تُبْغِضُوْنَهُمْ وَيُبْغِضُوْنَكُمْ وَتَلْعَنُوْنَهُمْ وَيَلْعَنُوْنَكُمْ.

(مسلم، کتاب الامارۃ)

"تمھارے اچھے خلفا وہ ہوں گے جن سے تم کو محبت ہو اور تم سے انھیں محبت ہو، اور جن کے لیے تم رحمت کی دعائیں کرو اور وہ تمھارے لیے کریں۔ اسی طرح تمھارے بُرے خلفا وہ ہوں گے جن سے تم بُغض رکھو اور وہ تم سے بُغض رکھیں، اور جن پر تم لعنت بھیجو اور وہ تم پر لعنت بھیجیں۔"

"اچھے خلفا وہ ہوں گے" یعنی ایک خلیفہ کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ اس کی اصل پوزیشن یہی ہے کہ لوگ اس کے لیے بہترین جذبات رکھیں، اس کے دل سے خیر خواہ ہوں، اور ان کی نگاہوں سے اس کی محبت اور عقیدت ٹپکی پڑتی ہو۔ چنانچہ ایک اور حدیث میں اس رویے کو دین داری کا راست تقاضا قرار دیا گیا ہے:

اَلدِّيْنُ النَّصِيْحَةُ قُلْنَا لِمَنْ قَالَ لِلّٰهِ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِاَئِمَّةِ الْمُسْلِمِيْنَ وَعَامَّتِهِمْ. (مسلم)

"دین اخلاص مندی کا نام ہے۔ ہم نے (یعنی صحابہؓ نے) پوچھا: "کس کے لیے اخلاص

مندی کا؟" ارشاد ہوا: "اللہ کے رسولؐ کے لیے، مسلمانوں کے خلفا کے لیے، اور عام مسلمانوں کے لیے۔"

یہی وجہ ہے کہ خلافت کی بیعت کو صرف ایک ظاہری اور رسمی اظہارِ وفاداری نہیں کہا گیا ہے، بلکہ "اپنی متاعِ قلب دے دینے" سے تعبیر کیا گیا ہے:

مَنْ بَايَعَ اِمَامًا فَاَعْطَاهُ صَفْقَةَ يَدِهٖ وَثَمْرَةَ قَلْبِهٖ فَلْيُطِعْهُ مَا اسْتَطَاعَ.

(مسلم، کتاب الامارۃ)

"جس نے خلیفہ سے بیعت کرلی، اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دیا اور اپنی متاعِ قلب اس کے حوالے کردی، اسے چاہیے کہ اپنے بس بھر اس کی پوری پوری اطاعت کرتا رہے۔"

گویا خلیفۃ المسلمین سے بیعت، عہدِ اطاعت ہی نہیں عہدِ اخلاص و محبت بھی ہے۔

۳۔ **بیعت برائے دین و آخرت:** خلافت کا تیسرا حق یہ ہے کہ اسے دنیا کی نہیں بلکہ دین کی ضرورت سمجھا جائے، اور خلیفہ سے جو بیعت کی جائے، اس کے پیچھے اصل محرک صرف آخرت اور رضائے الٰہی ہو۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

ثَلَاثَةٌ لَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ...... وَرَجُلٌ بَايَعَ اِمَامًا لَا يُبَايِعُهٗ اِلَّا لِدُنْيَا.

(بخاری، ج ۲، کتاب الاحکام)

"تین آدمیوں سے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن (بوجہ ناراضی) مخاطبت نہ فرمائے گا...... ایک اس شخص سے جس نے خلیفہ سے بیعت صرف دنیوی غرض سے کی ہو۔"

اس سے معلوم ہوا کہ خلیفۃ المسلمین کی بیعت یا اطاعت سے انکار ہی ایک مسلمان کے لیے ناروا اور مہلک نہیں ہے، بلکہ وہ نام نہاد بیعت اور اطاعت بھی ایسی ہی ثابت ہوگی جو محض دنیوی مصلحتوں کی خاطر کی گئی ہو۔ یہ صحیح ہے کہ دنیا میں عام طور سے حکومتوں کی وفاداریاں اسی طرح کی ہوا کرتی ہیں، اور یہی ان کے لیے بس بھی کرتی ہیں۔ مگر اسلام کا معاملہ بہت مختلف ہے۔ جس چیز کو دوسری حکومتیں اپنا آخری مطلوب سمجھتی ہیں، اسلام کی نگاہ میں اصلاً اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ اس کے نزدیک یہ اطاعت اور یہ بیعت اسی وقت باوزن اور قابلِ قدر ہوگی جب کہ وہ دین کی

ضرورت سمجھ کر اور اللہ کی رضا کی خاطر کی گئی ہو۔

خلافت اور خلیفۃ المسلمین کو یہ غیر معمولی حقوق جس وجہ سے دیے گئے ہیں، پچھلے مباحث میں اس کی پوری وضاحت بھی گزر چکی ہے۔ بیعت کو دین و آخرت کی ضرورت سمجھتے ہوئے منعقد کرنا خلافت کا حق اسی لیے ہے کہ خلافت کی حیثیت بنیادی طور پر یہی ہے۔ چنانچہ واضح دلائل کی روشنی میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ خلافت ایک اہم ترین دینی ضرورت ہے، اور اس کا قیام شرعاً واجب ہے۔ ظاہر ہے کہ جو منصب بنیادی طور پر ایک دینی منصب ہو اس کا وہی ماننا واقعی ماننا ہو سکتا ہے جب اسے دینی منصب سمجھ کر مانا گیا ہو، ورنہ اس کا ماننا ایک کھلا ہوا فریب ہوگا۔ آخر جس چیز کی اصل بنیادی حیثیت ہی کسی کو تسلیم نہ ہو، وہ اس کے تسلیم کرنے کا دعویٰ اگر کرتا ہے تو اس کے اس دعوے کو کون صحیح باور کر سکتا ہے؟ رہا محبت اور اطاعت کا حقوق خلافت میں سے ہونا، تو یہ بات بھی بڑی آسانی سے سمجھ میں آ جاتی ہے۔ جو منصب دین ہی کی خاطر قائم کی گئی ہو اور جس کی حیثیت سرتاسر شرعی ہو، اسے ایک مسلمان فطری طور پر محبت اور عقیدت ہی کی نظروں سے دیکھے گا، اور اس کے ساتھ اس کا عملی رویہ طاعت و فرماں برداری ہی کا ہوگا۔ یہی اس کے ایمان کا تقاضا ہوگا اور اسی میں اس کے جذبۂ دینی کو آسودگی مل سکے گی۔ خصوصاً اطاعت تو اس کے دین و ایمان کا راست اور بدیہی مطالبہ ہوگی۔ کیونکہ اس کے بغیر خلافت کا وجود ہی بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ آخر جہاں لوگ اطاعت کے لیے تیار ہی نہ ہوں، وہاں کسی حکومت اور امارت کا کیا مفہوم باقی رہ جائے گا؟ لوگوں کا اطاعت سے انکار تو عملاً نظامِ حکومت کے ختم ہو جانے کا واضح اعلان ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے جو آپ دیکھتے ہیں کہ خلفا کی اطاعت پر اتنا زور دیا گیا، اور امکان کی آخری حد تک اس فرض کے نباہنے کا حکم دیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ اس وقت بھی یہ فرض فرض ہی رہتا ہے جب رعایا کی پیٹھیں اُدھڑ رہی ہوں، اور اس وقت بھی اس حق اطاعت کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا جب جان و مال تک کی امان باقی نہ رہ گئی ہو۔ اسلام کے آئین میں یہ دفعہ صرف اس لیے ثبت کی گئی ہے کہ خلیفۃ المسلمین کی اطاعت کا معاملہ فی الواقع اس کی ذات کی اطاعت کا معاملہ نہیں ہے، بلکہ احکام خدا اور رسول کی

اطاعت کا، اور دین کے اجتماعی نظام کی بقا کا معاملہ ہے۔ اس لیے وہ اپنی ذات میں ناقص اور بے کردار سہی، مگر جب تک وہ خلافت کے منصب پر فائز ہے اسی کی فرماں روائی سے اس نظام کا عملی نفاذ وابستہ ہے، اسی پر دین کے ایک بڑے حصے کی پیروی موقوف ہے، اور اس کے بغیر مسلمانوں کی اجتماعی زندگی اسلامی بن ہی نہیں سکتی۔ یوں کہیے کہ وہ اس زمین پر دراصل اللہ تعالیٰ کی تشریعی حاکمیت کا عملی مظہر، اور اس کے اقتدار کا ظاہری نشان ہوتا ہے۔ کوئی شک نہیں کہ مسلمان سب کچھ سہے گا، اور ہر بات گوارا کر لے گا، مگر اس 'مظہر' کو غائب اور اس 'نشان' کو مٹا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔ وہ یہ تو ضرور برداشت کر لے گا کہ اسلام کے گھر میں بھی مسلمان کو سلامتی میسر نہ ہو، لیکن یہ کبھی برداشت نہ کرے گا کہ اسلام کا یہ گھر ڈھ جائے اور دین کے اجتماعی نظام سے وہ محروم ہو رہے۔ اور اگر کوئی اسے برداشت کرنے کے لیے تیار ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کے ایمان کی نبضیں چھوٹ چکی ہیں۔ کیونکہ وہ اپنی دنیا کے مفاد کو دینی نظام کی بقا پر کھلی ہوئی ترجیح دے رہا ہے، اور یہ ایک ایسی بات ہے جو ایمان و اسلام کے ساتھ کبھی اکٹھی نہیں ہو سکتی۔

طاعت کی حدود

یہی مصلحت جس کی خاطر اصحابِ امر کی اطاعت پر اتنا زور دیا گیا ہے، یہ تقاضا بھی کرتی ہے کہ اطاعت غیر معمولی حد تک ضروری تو ہو، مگر ہر حال میں ضروری نہ ہو، بلکہ ایک خاص حد کے بعد الٹا اس کا انکار ضروری بن جائے۔ کیونکہ ایک مسلمان اپنے امیر کی اطاعت میں جو کچھ بھی گوارا کرتا ہے، وہ صرف اسی لیے تو کرتا ہے کہ جہاں تک ہو سکے، اس نظام پر ضرب نہ لگنے پائے جس پر اجتماعی زندگی میں اس کا 'مسلمان' باقی رہنا موقوف ہے۔ لیکن اگر خدانخواستہ مطالبہ کسی ایسی اطاعت کا، یعنی کسی ایسی بات کے صرف گوارا کر لینے کا نہیں بلکہ اس کے کر ڈالنے کا ہو رہا ہو جس سے خود اس نظام کو مقصد ہی فوت ہو جاتا ہو، تو یقیناً وہ اسی بات کی مستحق ہوگی کہ اسے دیوار پر دے مارا جائے۔ چنانچہ شریعت نے جس صراحت اور زور کے ساتھ اطاعت امر کی تلقین کی ہے، اسی صراحت اور زور کے ساتھ یہ بھی فرما رکھا ہے کہ یہ اطاعت غیر مشروط ہرگز نہیں ہے بلکہ قطعی

مشروط ہے، اور ایک خاص حد کے اندر ہی کی جانی چاہیے۔ اس 'شرط' اور 'حد' کا تعین اس نے منفی جہت سے لفظ 'معصیت' کے ذریعے سے اور مثبت جہت سے لفظ 'معروف' کے ذریعے سے کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ:

لَاطَاعَةَ فِیْ مَعْصِیَةِ اللّٰهِ اِنَّمَا الطَّاعَةُ فِی الْمَعْرُوْفِ۔ (مسلم)

''اللہ کی معصیت کے کام میں کسی کی اطاعت نہیں، اطاعت صرف 'معروف' میں ہوگی۔''

یعنی اطاعت کی شرط یہ ہے کہ حکم کسی 'معروف' کا دیا گیا ہو، نہ کہ کسی 'معصیت' کا۔ معصیت کا حکم لازماً ٹھکرا دیا جائے گا اور اس کی تعمیل نہیں بلکہ عدم تعمیل ضروری ہوگی، ٹھیک ویسی ہی ضروری جیسی کہ 'معروف' کے حکم کے موقع پر اس کی تعمیل ضروری ہوتی ہے۔ امام نوویؒ لکھتے ہیں:

اجمع العلماء علی وجوبها فی غیر معصیة و علٰی تحریمها فی المعصیة.

(شرح مسلم جلد۲، کتاب الامارۃ)

''علما کا اس بات پر اجماع ہے کہ اصحابِ امر کی اطاعت ایسے کاموں میں جو معصیت کے نہ ہوں واجب ہے، اور ایسے کاموں میں جو معصیت کے ہوں، حرام ہے۔''

معصیت کے کاموں میں کسی بھی صاحبِ امر کی اطاعت کس حد تک ممنوع اور کیسی حرام ہے؟ اس بات کا اندازہ ایک واقعہ سے لگائیے:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک انصاری کی سرکردگی میں جہاد کے لیے ایک دستہ روانہ فرمایا، اور حسبِ دستور اسے ہدایت دے دی کہ اپنے امیر کی اطاعت کرتے رہنا۔ دورانِ سفر میں ایک بار وہ ان سے کسی بات پر ناراض ہو گئے اور انتہائی غصے کے عالم میں انھیں حکم دیا کہ لکڑیاں اکٹھی کریں۔ جب لکڑیاں اکٹھی کی جا چکیں تو کہا، ان لکڑیوں کو آگ دے دو۔ جب آگ دے دی گئی تو انھیں مخاطب کر کے فرمایا:

''کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمھیں اس بات کی تاکید نہیں فرمائی ہے کہ میری سننا اور اطاعت کرنا۔''

لوگوں نے جواب دیا: ''ہاں، فرمائی ہے۔''

اس پر انہوں نے کہا: ''اچھا تو اس آگ میں پھاند پڑو۔''

یہ سن کر لوگ ایک دوسرے کی طرف تکنے لگے، اور کچھ لوگ اس حکم کی تعمیل پر تیار بھی ہو گئے۔ مگر اور لوگوں نے کہا:

''ہم تو آگ ہی سے بچنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بھاگ کر آئے تھے (پھر اب یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس میں از خود جا پھاندیں؟)''

غرض تھوڑی دیر بحث و تکرار اور کشش و پنچ کی یہی حالت رہی۔ اس دوران میں امیر لشکر کا غصہ بھی ٹھنڈا پڑ گیا، اور آگ بھی بجھ گئی۔ پھر جب یہ سب لوگ اپنی مہم سے فارغ ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں واپس پہنچے تو وہاں یہ پورا واقعہ بیان کیا گیا۔ آپؐ نے سننے کے بعد ان لوگوں کو خطاب کر کے، جو حکم امیر کی اطاعت میں آگ کے اندر پھاند پڑنے پر آمادہ ہو گئے تھے، فرمایا:

''اگر تم آگ میں پھاند پڑے ہوتے تو پھر قیامت تک اسی میں پڑے رہتے۔''

(مسلم، جلد دوم، کتاب الامارۃ)

اس واقعہ اور اس ارشاد نبوی سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اس وقت بھی حرام ہی رہتی ہے جب کہ وہ کسی امیر کے کہنے پر کی گئی ہو، اور ٹھیک ویسی ہی حرام رہتی ہے کہ کسی اور وقت ہو سکتی ہے۔ طاعتِ امر کا فلسفہ اسے ہرگز قابلِ معافی نہیں بنا دے سکتا۔

جس 'معروف' میں امرا کی اطاعت ضروری ہے، اس کی وسعتیں کہاں تک پہنچتی ہیں؟ اس کی وضاحت بھی اسی لفظ 'معصیت' سے ہو جاتی ہے جو مسئلۂ اطاعت کے منفی پہلو کو بیان کرنے کے لیے مذکورہ بالا حدیث اور دوسری بہت سی حدیثوں میں لایا گیا ہے۔ جب یہ فرما دیا گیا کہ ''معصیت کے کاموں میں کسی کی اطاعت نہیں، اطاعت تو صرف معروف میں ہوتی ہے'' تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ جن احکام کی تعمیل میں اللہ تعالیٰ کی 'معصیت' لازم نہ آ رہی ہو وہ سب کے سب ''معروف'' کے احکام ہوں گے، اور ان کی بجا آوری ضروری ہوگی۔ گویا وہ سارے امور جن کی نوعیت امورِ تدبیر کی ہوتی ہے اور جن میں مختلف پہلوؤں کے پیشِ نظر ایک سے زائد آرا ہو سکتی

ہیں، 'معروف' ہی کی حدود میں داخل ہیں۔ یعنی ایسے امور میں صاحب امر کے احکام کی معقولیت سے کسی شخص کو چاہے کتنا ہی شدید اختلاف کیوں نہ ہو، اور اپنی رائے کے صائب ہونے پر کتنا ہی گہرا اطمینان وہ کیوں نہ رکھتا ہو، ان احکام کو اسے تسلیم کرنا ہی پڑے گا، اور یہ اس کا شرعی فریضہ ہوگا۔ کیونکہ اس طرح کا ہر حکم 'معروف' کا حکم ہے، اور 'معروف' میں امیر کی اطاعت ایک مسلمان کے لیے ضروری ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ ایک شخص کو اپنی رائے کے صائب ہونے پر جو اطمینان ہو وہ بالکل صحیح بنیادوں پر ہو، اور رائے فی الواقع اسی کی ٹھیک ہو، مگر اس کے باوجود اسے یہ حق ہرگز حاصل نہ ہوگا کہ وہ امیر پر کم اندیشی اور بے تدبیری کا الزام لگا کر اطاعت سے انکار کر دے۔ اس انکار کا حق اسے نہ تو اس کا اپنا ذوق اور وجدان دلا سکتا ہے، نہ اپنی دُور اندیشی اور اصابت رائے کا یقین، اور نہ دنیا کی کوئی اور چیز۔ یہ حق اسے صرف اسی وقت مل سکتا ہے جب کہ حکم 'معروف' کا نہیں، بلکہ اللہ کی 'معصیت' کا دیا گیا ہو۔ ایسی حالت میں تو اس کا یہ حق ہی نہیں بلکہ فرض ہوگا کہ اس کی اطاعت سے صاف انکار کر دے۔

خلفا کی معزولی

خلفا اور امرا کی اطاعت کے بارے میں شریعت کی ان مختلف ہدایتوں کو پڑھتے ہوئے ذہن میں لازماً یہ سوال اٹھ کھڑا ہوتا ہے کہ اصحابِ امر کی ممکنہ بے کرداریوں اور زیادتیوں کے تقاضے آیا صرف یہی کچھ ہیں جو ابھی بیان ہوئے، یا ان کے علاوہ بھی کچھ ہیں؟ کیا شریعت کی ہدایت صرف یہیں تک محدود ہے کہ اگر یہ لوگ ظلم و بربریت پر اتر آئیں تو اسے صبر سے برداشت کیا جاتا رہے، حتیٰ کہ اگر معصیت کا حکم دیں تب تو اس کی تعمیل نہ کی جائے، لیکن باقی معاملات میں ان کی اطاعت سے پھر بھی انکار نہ کیا جائے، یا اس کے آگے بھی اس نے کچھ فرمایا ہے؟ واضح تر لفظوں میں یہ کہ کیا بے کرداریوں اور زیادتیوں کی کسی حد میں داخل ہو جانے کے بعد سرے سے امارت اور خلافت کا استحقاق بھی ختم ہو جاتا ہے یا نہیں؟ اور کیا فکر و عمل کا کوئی بگاڑ ایسا بھی ہے جس میں مبتلا ہو جانا منصب خلافت سے معزول کر دیے جانے کا سبب بن جاتا ہے؟

اس سوال کا جواب شریعت نے اثبات میں دیا ہے۔ جسے سمجھنے کے لیے ہمیں ذرا تفصیل میں جانا ہوگا۔ یعنی پہلے اصولی طور پر اس بات کا جائزہ لینا ہوگا کہ خلفا کے فکر و عمل میں بگاڑ کس کس نوعیت کا پیدا ہوسکتا ہے؟ یہ جائزہ سامنے آنے پر ہی ان صورتوں کا واضح تعین ہوسکے گا جن کے پیش آجانے کے بعد کوئی شخص خلافت کا استحقاق کھو دیتا ہے۔ اس جائزے کے لیے اگر آپ گہری نظر سے کام لیں گے تو معلوم ہوگا کہ فکر و عمل کا بگاڑ حسب ذیل چھ نوعیتیں اختیار کرسکتا ہے:

۱۔ صاحب امر رعایا کے حقوق نہ ادا کرے، اور ان پر ظلم و ستم روا رکھے۔

۲۔ وہ لوگوں کو معصیت کے کاموں کا بھی حکم دینے لگے۔

۳۔ وہ بدکردار ہوجائے، احکامِ شرع کی علانیہ خلاف ورزی پر اُتر آئے، اور فسق و فجور کا ارتکاب کرنے لگے۔

۴۔ وہ دین کی اہم ترین عملی بنیادوں اور ضروری علامتوں، یعنی ارکانِ اسلام کا بھی تارک ہوجائے۔

۵۔ اسلام سے اس کا بُعد اس حد کو پہنچ جائے کہ وہ مملکت کے آئین و قانون کو بھی بدل ڈالے، اور اس میں غیر اسلامی عناصر کو لا داخل کرے۔

۶۔ وہ اسلام کے بنیادی عقائد تک سے پھر جائے، اور کفر اختیار کرلے۔

جہاں تک پہلے دو قسم کے بگاڑوں کا تعلق ہے، ان کے بارے میں شریعت کی ہدایت اوپر وضاحت سے بیان کی جاچکی ہے۔ اور وہ یہ کہ ان خرابیوں کے باوجود متعلقہ شخص کی امارت کو چیلنج نہ کیا جائے گا، اور 'معروف' میں اس کی اطاعت بدستور لازم رہے گی۔

تیسری نوعیت کے بگاڑ کا بھی یہی حکم ہے۔ یعنی اصحابِ امر کی فاسقانہ حرکتوں سے تو مسلمان سخت بیزار رہے گا، اور ضروری ہے کہ بیزار رہے۔ لیکن ان کی امارت کو بدستور تسلیم کرتے رہنے سے انکار نہ کرسکے گا، اور نہ 'معروف' میں ان کی اطاعت سے دست کشی اس کے لیے جائز ہوگی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

.........اَلا مَنْ وُلِّیَ عَلَیْهِ وَالٍ فَرَاٰهُ یَاْتِیْ شَیْئًا مِّنْ مَعْصِیَةِ اللّٰهِ فَلْیَکْرَهْ مَا یَاْتِیْ

مِنْ مَّعْصِيَةِ اللّٰهِ وَلَا يَنْزِعَنَّ يَدًا مِّنْ طَاعَةٍ. (مسلم، کتاب الامارۃ)

...........''سن رکھو! جن لوگوں کے اُوپر کوئی حاکم مقرر کیا گیا ہو، اور وہ اس سے ایسی حرکتیں سرزد ہوتے دیکھیں جو معصیت کی حرکتیں ہوں، تو انھیں چاہیے کہ اس کی ان حرکتوں سے نفرت اور ناگواری رکھیں، لیکن ساتھ ہی اس کی اطاعت سے وست کشی ہرگز نہ اختیار کریں۔''

چنانچہ اس بارے میں علما کا اجماع ہے کہ فسق کے ارتکاب سے خلیفہ معزول نہیں ہو جایا کرتا، اور محض اس فسق کی بنا پر اس کے خلاف بغاوت کرنا صحیح نہیں، بلکہ حرام ہے۔

(شرح مسلم للنووی، کتاب الامارۃ)

اب چوتھی نوعیت کو لیجیے۔ اس قسم کے بگاڑ میں اگر صاحب امر مبتلا ہو جائے تو اس کے ساتھ مسلمان کس طرح پیش آئیں؟ آیا وہ اب بھی اس خلافت اور امارت کو تسلیم کرتے رہیں اور 'معروف' میں اس کی اطاعت کو اپنے لیے لازم سمجھیں، یا کوئی اور رویہ اختیار کریں؟ اس سوال کا جواب آپ کو ان حدیثوں سے ملے گا:

يُسْتَعْمَلُ عَلَيْكُمُ الْاُمَرَاءُ فَتَعْرِفُوْنَ وَتُنْكِرُوْنَ .... قَالُوْا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَفَلَا نُقَاتِلُهُمْ قَالَ لَا مَا صَلُّوْا. (مسلم، کتاب الامارۃ)

''تم پر امرا مقرر ہوں گے، جن کی کچھ باتوں کو تم پسندیدہ اور اچھی پاؤ گے اور کچھ کو ناپسندیدہ اور بری........... (صحابہؓ نے) پوچھا: ''تو کیا اے اللہ کے رسولؐ! ایسی حالت میں ہم ان سے جنگ نہ کریں؟'' فرمایا: ''جب تک وہ نماز پڑھیں (اور اس کے تارک نہ بنیں) ایسا نہ کرنا۔''

...........وَشِرَارُ اَئِمَّتِكُمُ الَّذِيْنَ تُبْغِضُوْنَهُمْ وَيُبْغِضُوْنَكُمْ........... قِيْلَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَفَلَا نُنَابِذُهُمْ بِالسَّيْفِ فَقَالَ لَا مَا اَقَامُوْا فِيْكُمُ الصَّلٰوةَ. (مسلم، کتاب الامارۃ)

...........''تمھارے بُرے خلفا وہ ہوں گے جن سے تم بغض رکھو اور وہ تم سے بغض رکھیں...... پوچھا گیا: ''اے اللہ کے رسول! تو کیا ہم ایسے خلفا کے ساتھ تلوار کا معاملہ نہ کریں؟'' ارشاد ہوا: ''نہیں، جب تک وہ تمھارے اندر نماز قائم کرتے رہیں ایسا نہ کرنا۔''

ان حدیثوں سے نماز کی حد تک تو، جو اسلام کے عملی ارکان میں سے سب سے پہلا اور سب سے اہم رکن ہے، بات بالکل صاف ہو جاتی ہے، یعنی یہ کہ جو شخص نماز چھوڑ بیٹھے وہ مسلمانوں کا نہ کوئی چھوٹا حاکم رہ سکتا ہے نہ بڑا، نہ اس کی امارت برقرار رہ سکتی ہے نہ امامت اور خلافت۔ اس نے جہاں نماز سے بے تعلقی اختیار کی، مسلمانوں کو اس بات کا حق مل جائے گا، یا ان پر یہ ذمہ داری عائد ہو جائے گی کہ اسے معزول کر دیں، اور اگر وہ منصب چھوڑنے سے انکار کر دے تو تلوار کی نوک سے ہٹا کر دُور پھینک دیں۔ چنانچہ قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں کہ اس بارے میں علما کا اجماع ہے:

اجمع العماء علیٰ ان الامامة لا تنعقد لکافرو علی انه لو طرٔ علیه الکفر انعزل و کذا لو ترک اقامة الصلوٰة و الدعا الیها. (شرح مسلم للنووی، جلد دوم)

''علما کا اس بات پر اجماع ہے کہ کوئی کافر خلیفہ نہیں بنایا جا سکتا، اور اگر خلیفہ منتخب ہونے کے بعد متعلقہ شخص کبھی مبتلائے کفر ہو جائے تو خلافت سے فوراً معزول ہو جائے گا، اور ایسا ہی اس وقت بھی ہوگا جب وہ نماز کا قائم کرنا اور دوسروں کو اس کی تلقین و تاکید کرنا چھوڑ بیٹھے۔''

اب رہا باقی ارکان اسلام کا معاملہ، تو ان کے سلسلے میں ہمیں اس طرح کی کوئی واضح ہدایت کتاب و سنت کے اندر نہیں ملتی جیسی کہ نماز کے سلسلے میں ملتی ہے۔ البتہ بعض اصولی قسم کے ارشادات ایسے ضرور ملتے ہیں جن سے اس بارے میں رہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے۔ مثلاً عبادہؓ بن صامت روایت کرتے ہیں کہ:

وَعَانَا النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمْ فَبَایَعْنَا فَقَالَ فِیْمَا اَخَذَ عَلَیْنَا عَلَی السَّمْعِ والطَّاعَةِ .... وَعَلٰی اَلَّا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَهْلَه' اِلَّا اَنْ تَرَوْا کُفْرًا بَوَّاحًا عِنْدَکُمْ مِنَ اللّٰهِ فِیْهِ بُرْهَانٌ. (بخاری، جلد دوم، کتاب الفتن)

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے بلا کر بیعت لی۔ اس بیعت میں آپؐ نے ہم سے جن باتوں کا عہد لیا ان میں یہ باتیں داخل تھیں: یہ کہ ہم (امرا کے احکام) سنیں گے اور (ان کی) اطاعت کریں گے .... اور یہ کہ صاحب حکومت سے اقتدار حکومت کے

بارے میں کش مکش نہ کریں گے، سوائے اس وقت کے جب کہ ہم اس سے کھلا ہوا کفر دیکھ لیں، جس کے کفر ہونے پر ہمارے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے واضح دلیل موجود ہو۔''

اس حدیث میں صاحب حکومت کے خلاف قدم اٹھانے کی اجازت دینے سے شریعت کا صرف اس وقت تک انکار ثابت ہوتا ہے جب تک کہ اس سے ''کھلا ہوا کفر'' صادر نہ ہو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس سے جہاں ''کھلا ہوا کفر'' صادر ہوتے دیکھ لیا گیا اس کا استحقاق خلافت ختم ہو گیا۔ یہاں ایک بات قابل غور اور وضاحت طلب ہے، اور وہ یہ کہ یہاں 'کفر' سے مراد کیا ہے؟ کیا اس سے مراد صرف اعتقادی کفر ہے، یا اس میں عملی کفر بھی شامل ہے؟ اگر اس حدیث کے منشا پر غور کرتے وقت ان دونوں حدیثوں کو بھی سامنے رکھ لیا جائے جو نماز کے سلسلے میں ابھی درج کی جا چکی ہیں، تو دوسری بات ہی قرین قیاس معلوم ہو گی۔ کیونکہ ان تینوں حدیثوں میں مسئلہ ایک ہی بیان کیا گیا ہے، اور وہ یہ کہ وہ کون سی حالت ہے جس کے پیدا ہو جانے کے بعد منصب خلافت کا استحقاق چھن جاتا ہے؟ اس 'حالت' کو پہلی دونوں حدیثوں میں 'ترکِ نماز' کی حالت فرمایا گیا ہے، جب کہ اس آخری حدیث میں اس کے اظہار و بیان کے لیے ''کھلے ہوئے کفر'' (کفر بواح) کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب ایک ہی حالت کی تعیین و توضیح کے لیے مختلف مواقع پر مختلف الفاظ لائے جائیں تو وہ صرف ظاہراً مختلف ہوں گے، معناً مختلف نہ ہوں گے۔ اور اگر ان میں معنی کا کوئی اختلاف ہو گا بھی تو صرف اجمال و تفصیل کا، یا جز اور کل کا ہو گا، نہ کہ اصل اور بنیاد کا۔ اس لیے تسلیم کرنا پڑے گا کہ آخری حدیث میں ''کفر بواح'' سے مراد اعتقادی کفر کے علاوہ عملی کفر بھی ہے۔ کیونکہ ایک ہی حالت کے اظہار و بیان کے لیے ایک جگہ 'ترک نماز' کے الفاظ لانا اور دوسری جگہ کھلے ہوئے 'کفر' کے الفاظ کا استعمال کرنا اس حقیقت کا صاف اعلان ہے کہ ترک نماز بھی 'کفر بواح' کی ایک متعین شکل ہے۔ پھر چونکہ نماز پڑھنا ایک عمل ہے، عقیدہ نہیں ہے، اس لیے نماز کا قائم کرنا ایک 'فعل' کا ترک ہے، کسی 'عقیدے' کا ترک نہیں ہے۔ ایسی شکل میں ترکِ نماز کو بھی ''کفر بواح'' کہنا اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ یہاں کفر سے مراد کفر عملی بھی ہے۔ غالباً

یہی وجہ ہے کہ اس 'کفر بواح' کے لیے اِلَّا اَنْ تَسْمَعُوْا، (اِلا آں کہ تم سنو) یا اِلَّا اَنْ تَعْلَمُوْا (الا آں کہ تمھیں معلوم ہو) کے بجائے ''اِلَّا اَنْ تَـــرَوْا'' (الا آں کہ تم دیکھو) کے الفاظ ارشاد ہوئے ہیں، تا کہ اس میں عملی کفر کا موجود ہونا پوری طرح نمایاں رہے۔

جب یہ بات واضح ہو چکی کہ اس حدیث میں 'کفر' سے مراد کفر عملی بھی ہے، تو اب غور کرنے کی بات صرف یہ رہ جاتی ہے کہ کیا صرف نماز ہی ایک ایسا عمل ہے جسے چھوڑ بیٹھنے کو عملی کفر کہا جاسکتا ہے، یا دوسرے ارکان دین کو بھی یہی حیثیت حاصل ہے؟ اس مسئلہ میں دونوں ہی رائیں ہوسکتی ہیں، 'ہاں' کی بھی اور 'نہیں' کی بھی۔ 'ہاں' کی اس لیے کہ قرآن اور حدیث سے ان اعمال کے چھوڑ بیٹھنے کو بھی عملی کفر سمجھا جاسکتا ہے، اور سمجھا گیا ہے۔ 'نہیں' کی اس لیے کہ جس صراحت کے ساتھ نماز کو کفر و اسلام کی حدِ فاصل اور اس کے چھوڑ دینے کو عملی کفر فرمایا گیا ہے، اتنی صراحت کسی اور رکن دین کے بارے میں قرآن یا حدیث کے اندر نظر نہیں آتی۔

اب پانچویں نوعیت کے بگاڑ کو لیجیے۔ مملکت کے اسلامی کردار کا تحفظ نہ کرنے والے اور اس کے آئین و قانون میں غیر اسلامی عناصر لا داخل کرنے والے خلیفہ کے ساتھ کیا برتاؤ ہونا چاہیے، اس بات کا فیصلہ بنیادی طور پر یہ آیت کرتی ہے:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ۔ (المائدہ:۴۴)

''جو لوگ اللہ کے نازل کیے ہوئے قوانین کے مطابق معاملات کا فیصلہ نہیں کرتے سو وہی کافر ہیں۔''

قرآن مجید کی یہ آیت صراحت کرتی ہے کہ اسلامی قوانین کو چھوڑ کر غیر اسلامی قوانین کے مطابق فیصلہ کرنا 'عملی کفر' ہے۔ غور کیجیے، اگر اسلامی قوانین کو چھوڑ کر غیر اسلامی قوانین کے مطابق فیصلہ کرنا عملی کفر ہے تو مملکت کے آئین کو یا اس کے مجموعۂ قوانین کے کسی حصہ کو غیر اسلامی اصول و قوانین سے بدل کر رکھ دینا کیا کچھ نہ ہوگا؟ کوئی شک نہیں کہ اگر وہ عملی کفر ہے تو یہ شدید ترین عملی کفر ہوگا۔ 'عملی کفر' کا استحقاق خلافت کے معاملے پر جو اثر پڑتا ہے، اسے ہم ابھی جان چکے ہیں،

اوروہ یہ کہ اب یہ استحقاق باقی نہیں رہ جاتا۔اس لیے اس بگاڑ میں مبتلا ہو جانے والے کے بارے میں شریعت کا فیصلہ اس کے سوا اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا کہ ایسے صاحب امر کو امارت کی مسند سے اٹھا کر دُور پھینک دیا جائے۔جیسا کہ قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں کہ:

فلوطرٔ علیه کفر او تغییر للشرع اوبدعة خرج عن حکم الولایة وسقطت طاعة ووجب علی المسلمین القیامه علیه و خلعه و نصب امام عادل ان امکنهم ذالک. (شرح مسلم،للنووی،کتاب الامارۃ)

''پس اگر خلیفہ کفر میں مبتلا ہو جائے،یا احکام شریعت کو بدل ڈالے،یا بدعت اختیار کرلے تو حکومت کرنے کا سزاوار نہیں رہ جاتا،اور مسلمانوں پر سے اس کی اطاعت کا فرض ساقط ہو جاتا ہے اور ضروری ہو جاتا ہے کہ اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں،اسے معزول کر دیں، اوراس کی جگہ کسی اور عادل شخص کو مقرر کرلیں،اگر ان کے بس میں ہو۔''

امام نوویؒ قاضی صاحبؒ کے ان لفظوں کو نقل کرنے کے بعد——اوراس نقل کرنے کے معنی ہی یہ ہیں کہ موصوف کی رائے بھی یہی ہے——مذکورہ بالا حدیثوں کی شرح کرتے ہوئے ''لَامَا صَلُّوْا'' اور''لَا مَا اَقَامُوْا فِیْکُمُ الصَّلٰوۃَ'' کا مدعا ان لفظوں میں بیان کرتے ہیں:

فیه معنی ما سبق انه لا یجوز والخروج علی الخلفاء بمجرد الظلم اوالفسق ما لم یغیروا شیئًا من قواعد الاسلام. (شرح مسلم للنووی،کتاب الامارۃ)

''اس میں بھی وہی حقیقت بیان ہوئی ہے جو اُوپر مذکور ہو چکی،یعنی یہ کہ خلفا جب تک اسلام کے بنیادی اور قطعی احکام میں کوئی تبدیلی پیدا کرنے کی جسارت نہ کریں اس وقت تک ان کے محض ظلم اور فسق کی بنا پر ان کے خلاف بغاوت کرنا جائز نہ ہوگا۔''

ان توضیحات سے یہ بات پوری طرح روشن ہو جاتی ہے کہ اسلامی قوانین کو اگر کوئی خلیفہ غیر اسلامی قوانین سے کسی حد میں بھی بدل دیتا ہے تو اس کے بعد خود اسے بھی بدل دیا جانا چاہیے۔

اب آخری اور چھٹی نوعیت کے بگاڑ کے متعلق کچھ کہنا بالکل غیر ضروری ہوگا۔جب 'عملی کفر'

ہی خلافت سے معزولی کو ضروری ٹھیرا دیتا ہے تو 'اعتقادی کفر' کے بعد اس میں کسی تامل کی گنجائش ہی کہاں رہ سکتی ہے؟ اسلام اور ایمان تو استحقاقِ خلافت کی سب سے پہلی، سب سے ضروری اور ہر طرح سے متفق علیہ شرط ہے۔ اگر کوئی شخص اس شرط پر پورا نہیں اترتا تو اس کے خلیفہ ہونے یا خلیفہ باقی رہنے کا سوال قطعاً خارج از بحث ہی نہیں بلکہ خارج از گمان بھی ہے۔ چنانچہ علما نے پورے اتفاقِ رائے سے فرمایا ہے کہ مسلمان ایسے شخص کو خلافت کے اقتدار پر قابض کسی حال میں بھی نہیں دیکھ سکتے جس نے اپنا رشتہ کفر سے جوڑ لیا ہو۔ حافظ ابنِ حجرؒ لکھتے ہیں کہ:

انه ینعزل بالکفر اجماعا فیجب علی کل مسلم القیامه فی ذالک فمن قوی علیٰ ذالک .... فله الثواب و من داهن فعلیه الاثم و من عجز وجبت علیه الهجرة من تلک الارض. (فتح الباری، جلد ۱۳، صفحہ ۱۰۱)

''خلیفہ کفر اختیار کر لینے پر خلافت سے معزول ہو جاتا ہے، اس پر اجماع ہے۔ اس لیے ہر مسلمان پر واجب ہے کہ (جب ایسی صورت پیش آئے تو) اس کام کے لیے اٹھ کھڑا ہو۔ جو لوگ اپنے اس فریضے کو انجام دیے جائیں گے انھیں ثواب ملے گا، جو مداہنت برتیں گے وہ گناہ گار ٹھیریں گے، اور جو (ارادے اور کوشش کے باوجود اس مہم میں شریک ہونے سے) مجبور ہوں گے ان کے لیے ضروری ہوگا کہ اس سرزمین سے ہجرت کر جائیں۔''

ان تفصیلات سے معلوم ہوا کہ اعمال و عقائد کے بگاڑ کی مذکورہ بالا چھ ممکن صورتوں میں سے پہلی تین کے اندر خلیفہ کے حقِ خلافت کو چیلنج کرنے کی شرعاً ممانعت[1] ہے، اور آخری تین صورتوں

---

[1] اس ممانعت کے معنی یہ ہرگز نہیں ہیں کہ خلفا اور امرا کے ہر ظلم، ہر فسق اور ہر حکمِ معصیت کو خاموشی کے ساتھ برداشت کیا جاتا رہے۔ بلکہ حقیقت اس سے بہت کچھ مختلف ہے۔ شریعت نے اگر خون خرابے کے بڑے مفسدے سے بچنے کے لیے نتیجتاً ان چھوٹے مفاسد کو انگیز کر جانے کی ہدایت فرمائی ہے، تو ساتھ ہی اس بات کی بھی زبردست تلقین کی ہے کہ جب بھی اہلِ حکومت کی طرف سے اس طرح کی کوئی برائی سرزد ہوتی دیکھی جائے ان کی اصلاح کی پوری کوشش کی جائے، ان کے سامنے حق بات لائی جائے اور انہیں راہِ راست پر لانے کی ہر وہ پر امن تدبیر لازماً اختیار کی جائے جو اختیار کی جا سکتی ہو۔ اوپر حضرت عبادہؓ بن صامت کی جو حدیث بَایَعنَا رَسُولُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم عَلَی السَّمعِ وَالطَّاعَةِ الخ گزر چکی ہے، اس کے باقی الفاظ یہ ہیں: ''وَعَلٰی اَن نَّقُولَ بِالْحَقِّ اَینَمَا کُنَّا لَانَخَافُ فِی اللّٰہِ لَومَةَ لَائِمٍ'' (باقی صفحہ ۹۸ پر)

میں اسے معزول کر دینے کی ہدایت ہے۔

یہ بات کہ بگاڑ کی ان تین صورتوں میں امام کی معزولی کیوں ضروری ہو جاتی ہے، غالباً کسی بحث اور دلیل کی محتاج نہیں۔ جیسا کہ اوپر کی سطروں میں بتایا جاچکا ہے، اسلام اور اہلِ اسلام کو حکومت کا نظام بجائے خود مطلوب نہیں ہے، بلکہ بعض اہم مصالح اور عظیم مقاصد کے حاصل کرنے کا وہ محض ایک لازمی ذریعہ ہے، اور ان مصالح و مقاصد میں سے بھی اولین اور بنیادی اہمیت شرعی قوانین کے نفاذ کو حاصل ہے۔ اب اگر اس حکومت کا سربراہ خدانخواستہ اسلام ہی سے برگشتہ ہو جاتا ہے تو اس سے عام نظم ونسق کے چلانے کی توقع تو ضرور باقی رکھی جاسکتی ہے، لیکن یہ توقع خواب وخیال میں بھی نہیں کی جاسکتی کہ وہ اپنے اختیار واقتدار کو، اپنی فکری اور عملی قوتوں کو، اور اپنی منصبی کارکردگی کو اس مطلوب کے حاصل کرنے میں صرف کرے گا جسے اسلام اپنے نظامِ مملکت کے قیام کی بنیادی غایت قرار دیتا ہے۔ اس کے بخلاف پورے یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ وہ اپنی ساری طاقت اس کے خلاف ہی استعمال کرے گا۔ اس لیے کوئی شک نہیں کہ اس کے ہاتھوں سے زمامِ خلافت کا چھین لینا عین منشائے اسلام ہوگا۔ کچھ ایسی ہی صورت حال باقی دونوں صورتوں میں بھی پیش آسکتی ہے، اور ایک حد تک تو لازماً پیش آ کر رہے گی۔ جو شخص دین سے اس حد تک بے نیاز ہو چکا ہو کہ اس کی اہم ترین عملی بنیادوں سے بھی کوئی لگاؤ نہ رکھتا ہو، اور شریعت

(باقی حاشیہ صفحہ ۹۷) یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے جہاں خلفاء وامراء کی اطاعت کی اور ان کے منصبی اقتدار کو چیلنج نہ کرنے کی بیعت لی، وہیں اس امر کی بھی بیعت لی کہ، خواہ کوئی موقع ہو کلمۂ حق کہنے سے باز نہ آئیں گے۔

کلام کا یہ انداز اور سیاق صاف بتاتا ہے کہ غلط کار امراء کے بارے میں مسلمانوں کا جو رویہ ہونا چاہیے وہ صرف اسی بات پر ختم نہیں ہو جاتا کہ وہ ان کی امارت کے خلاف قدم اٹھانے سے باز رہیں، معروف میں ان کی بدستور اطاعت کرتے رہیں اور ان کے ظلم وفسق پر صبر کریں، بلکہ اس کی حدیں ابھی اور آگے جاتی ہیں، اور وہ یہ کہ ان کے ظلم وفسق پر انہیں ٹوکیں بھی اور ان کے حکمِ معصیت پر انہیں قیامت سے ڈرائیں بھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ ایمان کو اس بات کی بار بار تلقین فرمائی ہے کہ جس طرح عام لوگوں کے بارے میں منکر سے روکتے رہنا مسلمان کا فریضہ ہے اسی طرح امراء وحکام کی غلط اور خلافِ شرع حرکتوں پر نکیر کرنا، اور اگر اس کی جرأت نہ ہو تو ان پر دل سے نفریں بھیجنا اس کے مومن ہونے کا لازمی تقاضا ہے۔

کے قوانین کو منسوخ کر دینے میں بھی اسے کوئی باک نہ محسوس ہوتا ہو، اس سے یہ امید ہرگز نہیں رکھی جاسکتی کہ خلافت کے اصل مقصد کا وہ سچے دل سے وفادار رہے گا؟ اس سے یہ تو شاید ممکن ہو کہ ملک کو وہ اقتصادی حیثیت سے دولت کا گھر، اور سیاسی حیثیت سے دنیا کا لیڈر بنا دے، مگر یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ وہ اسے بندگی رب کا گہوارہ اور خیر وصلاح کا مرکز باقی رکھے گا، اور اس کے عام شہری اس کی رہنمائی میں نماز قائم کرنے والے، زکوٰۃ دینے والے، معروف کی تلقین کرنے والے اور منکر سے روکنے والے بن سکیں گے۔ جب حقیقت یہ ہے تو بالکل واضح بات ہے کہ ایسے شخص کو اپنے اجتماعی نظام کا بدستور ذمہ دار بنائے رکھنا بالکل ایسا ہی ہوگا جیسے کہ چوروں اور ڈاکوؤں کو امن وحفاظت کی ذمہ داریاں سونپ دی جائیں۔

معزولی کے مسئلے پر تمدنی ارتقا کا اثر

مملکت کے حکمران کو معزول کب اور کس طرح کیا جائے؟ واضح طور پر یہ سیاسی نظم کا مسئلہ ہے، اور سیاسی نظام کا حال یہ ہے کہ اس کے بہت سے ضابطے اور طور طریقے ایسے ہوتے ہیں جن کی تعیین میں تمدنی حالات کا بھی بہت کچھ دخل ہوا کرتا ہے۔ اس لیے وہ ہمیشہ ایک سی حالت پر نہیں رہتے۔ جب تک ملک کا تمدن ابتدائی منزل میں ہوتا ہے، اس کا حکومتی اور سیاسی نظام بھی بہت مختصر اور سادہ ہوتا ہے، اور اس نظام کے اصول وضوابط بھی اپنے اندر بڑی محدودیت رکھتے ہیں۔ پھر جوں جوں تمدن آگے بڑھتا جاتا ہے، زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح سیاست کے ضابطے اور طور طریقے بھی بدلتے جاتے ہیں، اور مملکت کا نظام زیادہ اصول پسندانہ، زیادہ ترقی یافتہ، زیادہ وسیع اور زیادہ منضبط ہوتا جاتا ہے۔

اسلام ایک عالمی دین اور ابدی نظام حیات ہے، اس لیے حرکت اور نمو اس کی فطرت میں داخل ہے۔ تمدنی ارتقا کا وہ نہ صرف یہ کہ ساتھ دینا چاہتا ہے بلکہ اس کی رہنمائی اور نگرانی کرنا چاہتا ہے۔ کیونکہ یہ اس کی منصبی ذمہ داریوں میں شامل ہے۔ اسلام کی یہ صلاحیت اور اس کی یہ حیثیت چاہتی ہے کہ زمانے کے بدلتے ہوئے حالات اور تمدن کی پھیلتی ہوئی ضرورتوں کو وہ ہمیشہ نگاہ میں

رکھے، اور اپنے نظامِ سیاست کے اُن ضابطوں اور طور طریقوں کو نیا آب و رنگ، بلکہ نئی شکل و صورت دیتا رہے جو بنیادی احکام اور اصولی ہدایات کی حیثیت نہیں رکھتے۔ اس لیے اگر ایسے سیاسی ضوابط کو زمانے کی فراہم کی ہوئی آسانیوں کے مطابق بنا لیا جائے تو یہ کوئی 'بدعت' نہ ہوگی، بلکہ عین 'سنت' ہوگی، اسلام سے تجاوز نہ ہوگا، بلکہ عین منشائے اسلام ہوگا۔

خلفا کی معزولی کا مسئلہ بھی اسی ذیل میں آتا ہے۔ کیونکہ کسی خلیفہ کو کب تک خلیفہ باقی رکھنا چاہیے اور کب اور کس طرح ہٹا دیا جانا چاہیے، یہ بات قطعی طور پر سیاست کے انھی ضوابط میں شامل ہے جن کے تعین میں تمدنی حالات اور زمانے کے تقاضے بھی دخل رکھتے ہیں، اور جن کو دینی نظام میں اصول کی حیثیت حاصل نہیں ہے کہ ان میں کبھی کوئی تغیر ہو ہی نہ سکے۔ اس لیے آج جب کہ دنیا کے تمدنی اور اجتماعی حالات، بارہ تیرہ صدی پہلے کے مقابلے میں کافی بدل چکے اور آگے بڑھ چکے ہیں اور حکومتوں کی تبدیلی میں بڑی آسانیاں پیدا ہو چکی ہیں، یہ ایک اہم سوال پیدا ہو گیا ہے کہ آیا خلفا کی معزولی اب بھی صرف انھی تین حالتوں اور شکلوں تک محدود رہے گی جن کی اوپر کی بحث میں نشان دہی کی گئی ہے، یا بگاڑ کی باقی تین صورتوں میں سے بھی کسی صورت میں اس راستے کو اختیار کیا جا سکتا ہے؟ اس سوال کا جواب ایک اور سوال کے جواب پر موقوف ہے، اور وہ یہ کہ کیا لوگوں کی جان و مال کا تحفظ اور ان کے حقوق کی نگہداشت اسلامی ریاست کے مقاصد میں شامل ہے یا نہیں؟ اس سوال کا جواب یقیناً اثبات ہی میں ہوگا، اور اس بارے میں ہرگز کوئی دوسری رائے نہیں ہو سکتی۔ اس حقیقت کے سامنے آ جانے کے بعد پہلے سوال کا جواب بھی پردے میں نہ رہ جائے گا، اور وہ آپ سے آپ معلوم ہو جائے گا۔ یعنی یہ کہ آج حکومتوں کو بدلنے کے جو پرامن جمہوری طریقے رائج ہو چکے ہیں، ان سے کام لے کر اسلامی مملکت کے سربراہ کو اقتدار کی مسند سے اُس وقت بھی ہٹا دیا جا سکتا ہے، بلکہ ہٹا دیا جانا ضروری ہوگا، جب کہ وہ رعایا پر ظلم کرتا دیکھا جائے، یا فسق و فجور میں آلودہ نظر آئے، یا معصیت کے کاموں کا بھی حکم دیتا پایا جائے۔ کیونکہ اس طرح کی خرابیوں میں مبتلا ہو جانے کے بعد اس سے یہ توقع رکھنا بوالفضولی سے کم نہ ہوگا کہ اس

کے ہاتھوں لوگوں کی جان و مال کا تحفظ ہو سکے گا، ان کے حقوق کی نگہداشت ہو پائے گی، ان کے ذہنوں کو بدی اور بے کرداری کی شہ نہ ملے گی، اسلامی ریاست کی حرمت داغ دار نہ ہوگی، اور اس کے جملہ مقاصد اچھی طرح پورے ہوتے رہیں گے۔ پھر ایسے شخص کو معزول کرنے اور اس کے شر سے دین و ملت کو محفوظ کر لینے کی طاقت اور سہولت رکھنے کے باوجود خلافت کی ذمہ داریاں بدستور اسی کے سپرد کیے رکھنا کوئی معقول بات کیسے ہو سکتی ہے؟ کیا شریعت کے بارے میں ایک لمحے کے لیے بھی یہ گمان روا رکھا جا سکتا ہے کہ نظامِ خلافت کے مقاصد کو تو نقصان پر نقصان پہنچ رہا ہو، مگر وہ اپنے پیرووں کو اس صورت حال کے ازالے کی راہ اختیار کرنے سے روکتی رہے گی، حالانکہ وہ صاف کھلی دکھائی دے رہی ہو؟

اس سلسلے میں ان حدیثوں کے الفاظ سے کوئی الجھن یا غلط فہمی نہ ہونی چاہیے جن میں سے بعض کے حوالے اوپر گزر چکے ہیں، اور جو اس امر کی واضح ہدایت دیتی نظر آتی ہیں کہ جب تک خلیفہ ترکِ نماز کا یا کھلے ہوئے کفر کا مرتکب نہ ہو اس کے خلاف قدم اٹھانا ممنوع ہے۔ بلاشبہ ان احادیث سے ہمیں یہی ہدایت ملتی ہے۔ لیکن یہ ہدایت جس مصلحت کی بنا پر دی گئی ہے۔ اسے نظر انداز کر کے ان احادیث کا اصلی منشا اور ظالم و فاسق امرا کے بارے میں شریعت کا حقیقی نقطۂ نظر پوری طرح ہرگز نہ سمجھا جا سکے گا۔ اس لیے ضروری ہے کہ پہلے اس مصلحت کو معلوم کر لیا جائے۔ اس غرض کے لیے امام نوویؒ کا یہ واضح بیان بالکل کافی ہوگا:

اجمع اهل السنة انه لا ینعزل السلطان بالفسق .... قال العلماء و سبب علام العزل و تحریم الخروج علیه ما یترتب علٰی ذالک من الفتن و اراقة الدماء و فساد ذات البین فتکون المفسدة فی عزله اکثر منها فی بقائه۔ (شرح مسلم، کتاب الامارة)

''اہلِ سنت کا اس بات پر اجماع ہے کہ حکمران، فسق کی بنا پر معزول نہیں ہو جاتا.......... علما فرماتے ہیں کہ اس معزول نہ ہو جانے اور ایسے حکمران کے خلاف کسی بغاوت کے حرام

ہونے کی وجہ وہ فتنہ وفساد، خون خرابہ اور وہ باہمی کشاکش ہے جو اس اقدام کے نتیجے میں برپا ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کے معزول کر دینے کی جدوجہد کے نتیجے میں پیدا ہو جانے والی یہ خرابی اس کے خلیفہ باقی رہنے کی خرابی سے بھی بڑھ جاتی ہے۔"

یہ تو فاسق امرا کا مسئلہ رہا۔ ٹھیک اسی طرح کی بات علما نے ظالم امیروں کے بارے میں بھی فرمائی ہے۔ اور حق یہ ہے کہ جو شخص بھی اسلام سے واقف ہوگا، وہ اس کے سوا اور کوئی مصلحت اس ممانعت کی سوچ ہی نہیں سکتا۔ اس لیے اس بات کو ایک حقیقت تسلیم کر لینے میں کوئی تردد نہ ہونا چاہیے کہ بگاڑ کی جن صورتوں میں امرا کے خلاف اقدام کرنے سے منع کیا گیا ہے، صرف بدامنی، خانہ جنگی اور خون ریزی کے اندیشے ہی کی بنا پر منع کیا گیا ہے۔ ورنہ یہ ممانعت مطلق ہمہ گیر اور ابدی قطعاً نہیں ہے۔ گویا صورت واقعہ یہ ہے کہ شریعت کے نزدیک یہاں دو ناگزیر بلاؤں میں سے ایک کو لازماً اختیار کرنے کا معاملہ تھا: یا تو صاحب امر کے ظلم اور فسق کو گوارا کیا جائے، یا پھر اسے طاقت کے زور سے ہٹائے جانے کی شکل میں خانہ جنگی اور خون خرابے کے عذاب کو برداشت کیا جائے۔ اس نے دوسری بلا کو، جیسا کہ عقل سلیم چاہتی ہے، زیادہ سخت اور پہلی کو اس کے مقابلے میں کم سخت قرار دیا، اور اس لیے یہ ہدایت دی کہ اسے کلیجے پر پتھر رکھ کر انگیز کیا جائے، اور اس کے ازالے کے لیے قائم شدہ حکومت کے خلاف قدم اٹھا کر مملکت کو نراج کی، اور عام مسلمانوں کو قتل و غارت کی بھینٹ چڑھانے کی بدتر مصیبت کو مول نہ لیا جائے۔ جب کہ 'کفر عملی' یا 'کفر اعتقادی' کی حیثیت اس کے نزدیک اس کے برعکس تھی۔ کیونکہ امرا کی خرابیاں اور ضلالتیں خلافت کے مقاصد کو صرف نقصان ہی نہیں پہنچاتیں، بلکہ ان کا گلا گھونٹ دینے والی ہوتی ہیں، اور کوئی شک نہیں کہ یہ مقاصد مسلمان کے خون سے کم نہیں، زیادہ قیمتی ہیں۔ اس لیے یہ بلا شریعت کی نظر میں زیادہ سخت، اور اس کے مقابلے میں بدامنی اور خون خرابے کی بلا کم سخت ٹھیری تھی۔ جس کا فطری تقاضا یہی تھا کہ اس کے رُونما ہو جانے کی شکل میں وہ صاحب امر کے خلاف اقدام کی ممانعت کو واپس لے لیتی۔

اب جب کہ یہ بات ایک حقیقت کی حیثیت سے ہمارے سامنے آچکی کہ ظالم اور فاسق امرا کے خلاف قدم اٹھانے کی ممانعت صرف خانہ جنگی اور خوں ریزی کی مصیبت سے بچنے کے لیے کی گئی ہے، تو اسے بھی ایک حقیقت ہی ماننا پڑے گا کہ جہاں عملاً اس مصیبت کے برپا ہو جانے کا اندیشہ موجود نہ ہو وہاں یہ ممانعت بھی باقی نہ رہ جائے گی۔ اور اگر ہنگامے اور خون خرابے کے بغیر ہی حکومت کو بدل دینے کا موقع حاصل ہوگا تو ایسی حالت میں ظالم و فاسق حکمرانوں کو منصب حکومت پر باقی رکھنا کسی طرح صحیح نہ ہوگا۔ اس وقت عقل اور شریعت دونوں کا تقاضا صرف یہ ہوگا کہ انھیں اپنے منصب سے لازماً ہٹادیا جائے۔ چنانچہ حافظ ابن حجرؒ کا بیان ہے کہ:

نقل ابن التین عن الداؤدی قال الذی علیه العلماء فی امراء الجور انه ان قدر علیٰ خلعه بغیر فتنة ولا ظلم وجب والاّ فالواجب الصبر.

(فتح الباری، جلد ۱۳، صفحہ ۶)

''ابن التین نے داؤدی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ظالم امرا کے بارے میں علما کا فتویٰ یہ ہے کہ اگر انھیں کسی فتنے اور ظلم کے برپا ہوئے بغیر معزول کیا جاسکتا ہے تو ایسا کر ڈالنا واجب ہے، ورنہ واجب یہ ہے کہ صبر سے کام لیا جائے۔''

اسی طرح امام نوویؒ بعض دوسرے علما کی یہ وضاحت نقل کرتے ہیں کہ:

اما قوله "اِصۡبِرُوۡا" فذالک حیث یلزم من ذالک سفک الدماء او اثارة الفتنة و نحو ذالک. (مسلم، کتاب الایمان)

''رہا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کہ ''صبر سے کام لو'' تو اس کا تعلق ایسے حالات سے ہے جب کہ (امیر کے خلاف) اس (اقدام) سے خوں ریزی یا فتنہ وفساد یا اسی طرح کی کوئی اور بلائے عام پھوٹ پڑنے والی ہو۔''

غرض ظالم اور فاسق امرا کی معزولی کے بارے میں علمائے اسلام کا، جیسا کہ چاہیے، عام خیال یہی ہے۔ بلاشبہ آج سے ہزار بارہ سو برس پہلے کیا، ابھی ماضی قریب تک کے زمانوں میں بھی، صورتِ حال بالعموم یہی تھی کہ حکومتوں کی جبری تبدیلی آسان نہیں ہوا کرتی تھی، بلکہ اُس

وقت اس طرح کی ہر کوشش ملکی امن وامان کو آگ لگا دینے کے ہم معنی تھی۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظالم اور فاسق حکمرانوں کے معاملے میں تلقین بھی قدرتی طور پر، صبر وتحمل ہی سے کام لینے کی فرمائی۔ لیکن اس وقت اگر یہ صورت حال باقی نہیں رہ گئی ہے تو تسلیم کرنا چاہیے کہ اس تلقین وہدایت پر عمل کرنے کا موقع ومحل بھی باقی نہیں رہ گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ موجودہ زمانے میں ووٹوں کے ذریعے سے حکومت کے سربراہ منتخب کرنے کا، اور پھر بوقت ضرورت معزول کر دینے کا جو جمہوری طریقہ رائج ہو چکا ہے، اس سے کام لینا عین طریق اسلام اور عین تقاضائے دین ہوگا۔ جہاں بھی اس طریقے سے کام لینے کی آسانیاں حاصل ہوں، مسلمانوں کے اہلِ حل و عقد کا یہ فرض ہوگا کہ اس سے ضرور کام لیں۔ جب بھی ان کا امیر منصب خلافت کی ذمہ داریاں صحیح طریقے سے پوری کرنے میں ناکام ثابت ہو اسے علیحدہ کر دیں، اور اس کی جگہ کسی اہل شخص کو لامقرر کریں۔ کیونکہ اس طریقے سے حکومت کو بدل لینے میں فتنے، بدامنی اور خوں ریزی کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہاں دو بلاؤں —— ظالم اور فاسق حکمران کو گوارا کرتے رہنے کی بلا، یا خانہ جنگی اور خون خرابے کی بلا —— میں سے کسی ایک کو لازماً اختیار کرنے کا معاملہ ہے ہی نہیں کہ خون خرابے کی بلا کے مقابلے میں ظالم حکمران کے وجود کی بلا کو انگیز کرتے رہنے کا سوال پیدا ہو۔

پھر ضرورت صرف اسی بات کی نہیں ہے کہ خلیفہ جب کسی غلط کاری کا مظاہرہ کرے تو پارلیمنٹری طریق پر اسے امارت کے منصب سے ہٹا دیا جائے، بلکہ اس بات کی بھی ہے کہ چاہے اس کی طرف سے کسی ظلم یا کسی فسق یا اسی طرح کی کسی اور اہم غلط کاری کا مظاہرہ نہ ہوا ہو، پھر بھی اس کے سلسلۂ امارت کے جاری رہنے یا نہ رہنے کے بارے میں ایک معقول مدت کے بعد لوگوں کی رائیں معلوم کی جاتی رہیں۔ کیونکہ ہوسکتا ہے کہ موجودہ امیر سے چاہے کوئی قابل لحاظ کوتاہی سرزد نہ ہوئی ہو کہ اس کا ہٹا دیا جانا ضروری ہو، مگر بہت ممکن ہے کہ اس مدت میں ملت کے اندر سے کوئی اور شخصیت ابھر کر سطح پر آگئی ہو جس کی صلاحیتوں پر لوگوں کو نسبتاً زیادہ اعتماد ہو، اور انھیں یہ

توقع ہو کہ اگر موجودہ امیر کی جگہ اس شخص کو خلافت کی ذمہ داریاں سونپ دی جائیں تو وہ انھیں زیادہ بہتر طریقے پر انجام دے سکے گا۔ ایسی حالت میں کوئی وجہ نہیں کہ حکومت کو بدل نہ دیا جائے، اور محض اس بنا پر کہ ایک شخص کو پہلے اس منصب کے لیے منتخب کیا جا چکا ہے اور اس کی خلافت منعقد ہو چکی ہے، دوسرے افراد کی بہتر صلاحیتوں سے فائدہ نہ اٹھایا جائے۔ کیونکہ یہاں جو کچھ اہمیت ہے، خلافت، خلافت کے مقاصد اور اس کی ذمہ داریوں کی ہے، کسی شخصیت کی اور اس کے کسی حق کی نہیں ہے۔ زیادہ واضح لفظوں میں یہ کہ اسلام میں حکومت اور امارت اصلاً صرف ذمہ داری ہے، حق ہے ہی نہیں۔ اس لیے اگر کسی شخص کو خلافت کے منصب سے ہٹایا جاتا ہے تو اس سے اس کا کوئی حق نہیں چھنتا کہ وہ اس کی شکایت کرے۔ بلکہ اس کے سر سے ایک بھاری ذمہ داری اتار لی جاتی ہے، اور وہ بھی صرف اس لیے کہ شریعت کے منشا اور خلافت کے مقصد کا تقاضا تھا۔

نظامِ خلافت کی وحدت

چونکہ نظامِ خلافت کی ضرورت، اہمیت اور نوعیت، سب کچھ اصلاً دینی ہے، بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ تمام تر دینی ہے، اس لیے اسلامی آبادیوں (دارالاسلام) کی حدیں چاہے کتنی ہی وسیع کیوں نہ ہو جائیں، سارے مسلمانوں کا خلیفہ اور امام ایک ہی ہوگا، اور مختلف خطوں میں الگ الگ حکومتیں اور خلافتیں قائم کر لینا صحیح نہ ہوگا۔ علامہ ماوردی لکھتے ہیں کہ:

لایجوزان یکون للامۃ امامان فی وقت واحد. (الاحکام السلطانیہ، صفحہ ۷)

''یہ بات جائز نہیں ہے کہ ایک ہی وقت میں اُمت کے دو خلیفہ ہوں۔''

اس بارے میں بعض اکے دکے افراد کو چھوڑ کر پوری امت یک رائے ہے۔ امام نووی کے بقول:

اتفق العماء علیٰ انہ' لا یجوز ان یعقد لخلیفتین فی عصر واحد سواء اتسعت دارالاسلام ام لا. (شرح مسلم، کتاب الامارۃ)

''علما کا اس بات پر اتفاق ہے کہ دارالاسلام کی حدیں چاہے وسیع ہوں یا غیر وسیع، ایک ہی زمانے میں دو دو آدمیوں کی خلافت کا قیام جائز نہیں۔''

شریعت نے اس اصول کو بڑی اہمیت دے رکھی ہے۔ اس کے نزدیک وہ شخص گردن زدنی ہے جس کے ہاتھوں پر ایک خلیفہ کے ہوتے ہوئے خلافت کی متوازی بیعت کرلی گئی ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا صریح ارشاد ہے کہ:

اِذَا بُوْیِعَ لِخَلِیْفَتَیْنِ فَاقْتُلُوا الْاٰخِرَ مِنْهُمَا. (مسلم، کتاب الامارۃ)

''اگر خلافت کی بیعت دو آدمیوں کے ہاتھوں پر کرلی جائے تو بعد والے شخص کو قتل کردو (اگر اس کی نام نہاد خلافت کا فتنہ کسی طرح ختم نہ ہوسکے)۔''

غرض 'وحدت' اسلامی نظامِ سیاست کا ایک مسلم اور بڑا اہم اصول ہے۔ اسلام اُمت کے لیے بیک وقت ایک سے زائد اجتماعی نظاموں کے وجود کو پوری شدت کے ساتھ رد کرتا ہے۔ ذرا غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اسے ایسا کرنا چاہیے تھا۔ کیونکہ یہ اس کے مزاج کا تقاضا تو تھا ہی، اس کے مشن کا، اور اس کے خلافتی نظام کے مقاصد کا بھی تقاضا یہی تھا۔ جیسا کہ پچھلے صفحات میں تفصیل سے معلوم ہوچکا، اسلام نے اپنے پیروؤں کو خلافت کا نظام قائم کرنے کی ہدایت اس لیے نہیں دی ہے کہ اس طرح دنیا کے سیاسی مطلع پر وہ بھی نمایاں رہیں گے، یا ان کی حوصلہ مند شخصیتوں کو اپنے جذبۂ حکمرانی کی تسکین کا موقع مل جائے گا، یا ان کے مختلف وطنی اور نسلی گروہ اپنے اپنے قومی 'انا' کو بلند کرنے کی خواہش پوری کرلیں گے۔ اس کے بخلاف اس نے یہ ہدایت صرف اس لیے دی ہے تاکہ وہ خود حکمران بن کر رہے، انسانی زندگی پر اس کی اور اس کی پیرو ملت کی، دشمنوں سے حفاظت ہو، اور اس کے غلبہ و اقتدار کی حدیں پھیلتی رہیں۔ ایسی حالت میں اگر پوری امت مسلمہ ایک گروہ، ایک قوم اور ایک سیاسی وحدت ہونے کے بجائے متعدد سیاسی وحدتوں میں بٹی رہے، اور اس طرح پورا دار الاسلام عملاً مختلف ریاستوں اور حکومتوں میں تقسیم ہوجائے، تو یہ اسلام کے قومی ہونے کی نہیں بلکہ کمزور ہونے کی علامت ہوگی۔ یہ امت کے شیرازہ بند اور متحد رہنے کی نفی ہوگی۔ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اللہ کی رسی کے علاوہ کچھ اور بھی رشتے ہیں جو اس کے حلقوں میں اتحاد و اجتماع کا مرکز ہونے کی حیثیت اختیار کرنا چاہتے ہیں، اور اب یہ ملت اندر سے پھٹ چلی ہے۔ اس لیے کفر

وضلال کے مقابلہ میں تن واحد نہ ثابت ہو سکے گی۔ ظاہر ہے کہ یہ صورت حال ان مقاصد کو غیر معمولی نقصان پہنچائے گی جن کی خلافت کا نظام قائم کیا گیا ہے۔ اس لیے اسلام نے بجا طور پر اس بات کی اجازت نہیں دی کہ مسلم دنیا، پوری کی پوری ایک ہی اسٹیٹ ہونے کے بجائے کئی اسلامی مملکتوں کی ''کامن ولتھ'' بھی بن سکتی ہے۔ اس کے برعکس اس نے ضروری قرار دیا کہ ایک ہی مشن کی علم بردار اُمت کو سیاسی طور پر بھی ایک ہی اُمت اور ایک ہی قوم رہنا چاہیے۔

رہا یہ سوال کہ پوری اُمت کے سیاسی طور پر بھی ایک ہی اُمت اور ایک ہی قوم بن کر رہنے کی انتظامی شکل کیا ہوگی؟ یعنی اس کا حکومتی نظام وحدانی قسم کا ہوگا، یا وفاقی؟ تو اس بارے میں دین کا عام مزاج، اس کی اجتماعی ہدایتوں کا رُخ، مقاصدِ خلافت کا مفاد اور خیر القرون کا طرزِ عمل، سب کے سب وحدانی طرزِ حکومت ہی کا فیصلہ دیتے ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ ہم اس امر واقعی کو نظر انداز بھی نہیں کر سکتے کہ اس ''فیصلے'' کا تعلق لازماً ایک ایسی صورت حال سے ہے جب کہ سارے مسلم علاقے جغرافیائی طور پر آپس میں ملے ہوئے ہوں اور ان کا سیاسی اقتدار بھی مسلمانوں کے اپنے ہی ہاتھوں میں ہو۔ یا جغرافیائی طور پر آپس میں ملے ہوئے نہ ہونے کے باوجود ان کے ایک ہی حکومتی نظم ونسق کے تحت رہنے میں کوئی رکاوٹ پیش نہ آتی ہو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر صورت حال یہ نہ ہو، یعنی سارے مسلم علاقے جغرافیائی طور پر آپس میں ملے ہوئے نہ ہوں، یا یہ سارے علاقے آپس میں ملے ہوئے تو ہوں مگر ان میں سے بعض ایسے بھی ہوں جو غیر مسلموں کے محکوم ہو چکے ہوں اور اس وجہ سے آزاد و خود مختار مسلم علاقے جغرافیائی طور پر آپس میں کٹ کر رہ گئے ہوں، تو ایسی صورتوں میں اس 'فیصلے' پر اصرار نہ کیا جا سکے گا۔ یہ نہ صرف عملی ضرورت ہی کا تقاضا ہے بلکہ بعض نصوص سے بھی ہمیں اسی طرح کی رہنمائی ملتی ہے۔

قبیلۂ عبد القیس جب اسلام کا حلقہ بگوش ہوا تو اس کے ایک وفد نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی:

''اے اللہ کے رسولؐ! ہمارے وطن اور آپؐ کے وطن کے درمیان مضر کے کفار حائل ہیں۔

اس لیے ہم جب چاہیں آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر ہدایتیں نہیں لے سکتے، بلکہ صرف حرمت کے خاص مہینوں ہی میں اس کا موقع مل سکتا ہے، اس لیے آپ ہمیں (ضروری) ہدایتیں اور احکام دے دیجیے، تاکہ ہم ان پر عمل کرتے رہیں اور پھر واپس جا کر دوسروں کو ان کی دعوت دیں۔"

آپؐ نے وفد کی گزارش کے جواب میں جو کچھ فرمایا اور جن امور کی تلقین کی ان میں سے ایک یہ بھی تھا:

وَاَنْ تُوَدُّوْا خُمُسَ مَا غَنِمْتُمْ. (مسلم، جلد اول، کتاب الایمان)

"تمھیں غنیمت کا جو مال ملے، اس کا پانچواں حصہ ادا کرتے رہنا۔"

غور کیجیے، اس ارشاد کا ذہنی پس منظر کیا رہا ہوگا؟ یقیناً یہی کہ یہ لوگ قبائل مضر کے کفار سے اپنی صواب دید کے مطابق جہاد کرنے کے مجاز ہوں گے، اور مرکزِ اسلام سے انھیں اس کے لیے بروقت حکم دیا جانا ضروری نہ ہوگا۔ حالانکہ کسی بھی وحدانی نظامِ حکومت میں یہ ضروری ہوتا ہے کہ ملک کے کسی حصے میں کوئی جنگی کارروائی مقامی ذمہ دار اسی وقت کر سکتے ہیں جب کہ مرکز کی طرف سے انھیں ہدایت موصول ہو چکی ہو۔ اس لیے قبیلہ عبدالقیس کو آپؐ نے بطور خود جنگی اقدامات کرتے رہنے کی جو منظوری عطا فرمائی، اس سے یہ بات سمجھی جا سکتی ہے کہ حالات اگر رکاوٹ ڈال رہے ہوں تو اسلامی مملکت کا نظام وحدانی طرز کے بجائے وفاقی طرز کا بھی بنایا جا سکتا ہے۔ کیونکہ قبیلۂ مذکور کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح کا اختیار، اور وہ بھی صلح و جنگ جیسے اہم مسائل میں دے دیا تھا وہ اختیار و مرتبے میں ان اختیارات سے کسی طرح کم نہ تھا جو کسی وفاقی نظام میں صوبائی حکومتوں کو حاصل ہوا کرتے ہیں۔

اس بحث کا حاصل یہ ہے کہ اصل اور معیاری طرز حکومت تو وحدانی طرز ہی ہے، لیکن مصالح کے پیشِ نظر وفاقی طرز کو بھی اپنایا جا سکتا ہے۔

❋ ..... ❋ ..... ❋